۱۹۵۱ء کے بہترین افسانے

مُرتبّہ

گوپال مِتّل

پبلشر

نیشنل اکاڈمی

۴۵۵۲ ڈپٹی گنج صدر بازار دہلی

(الاماں پرنٹنگ پریس دہلی)

دیباچہ

اس انتخاب کا عنوان کچھ غلط سا ہے "۱۹۵۱ء کے بہترین افسانے" کی بجائے اس کا عنوان یہ ہونا چاہیئے تھا۔ "۱۹۵۱ء کے افسانے جو میرے نزدیک بہترین ہیں۔"

انتخاب کے لئے اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے لاکھ اصول مقرر کیجئے لیکن ذاتی پسند اور ناپسند کا سوال پھر باقی رہتا ہے اور یہیں آکر انتخاب کرنے والے کے "دل کا معاملہ کھلتا ہے" شعروں کے انتخاب نے غالب کو رسوا کیا تھا ڈر ہے کہ افسانوں کا انتخاب کہیں مجھے رسوا نہ کر دے۔

گوپال متل

ان ہی لوگوں نے جو ابھی مارنے پر تلے بیٹھے تھے اپنے نیچے سے پیپل کی گولریں ہٹا دیں اور پھر سے بیٹھتے ہوئے بول اُٹھے، سنو، سنو، سنو ...."

رسالو اور نیکی رام نے سندرلال بابو کو ٹہوکا دیا اور سندرلال بولے "شری رام نیتا تھے ہمارے۔ پر یہ کیا بات ہے باوا جی۔ انھوں نے دھوبی کی بات کو ستیہ سمجھ لیا۔ پر اتنی بڑی مہارانی کے ستیہ پر وہ وشواس نہ کر پائے؟"

نارائن باوا نے اپنی داڑھی کی کھچڑی پکاتے ہوئے کہا "سیتا ان کی اپنی پتنی تھی سندرلال! تم اس بات کی مہانتا کو نہیں جانتے؟"

"ہاں بابا" سندرلال بابو نے کہا" اس سنسار میں بہت سی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ پر میں سچا رام راج اسے سمجھتا ہوں۔ جس میں انسان اپنے آپ پر بھی ظلم نہیں کر سکتا۔ اپنے آپ سے بے انصافی کرنا اتنا ہی بڑا پاپ ہے جتنا کسی دوسرے سے بے انصافی کرنا .... اور آج بھی بھگوان رام نے سیتا کو گھر سے نکال دیا ہے .... اس لئے کہ وہ راون کے پاس رہ آئی تھی .... اس میں کیا قصور تھا سیتا کا؟ کیا وہ بھی ہماری بہت سی ماؤں بہنوں کی طرح ایک چھل اور ایک کپٹ کی شکار نہ تھی؟ اس میں سیتا کے ستیہ اور استیہ کی بات ہے یا راکشش راون کے وحشی پن کی بات ہے جس کے دس سر انسان کے ہیں لیکن ایک اور سب سے بڑا سر گدھے کا ہے ...."

آج ہماری سیتا نردوش گھر سے نکال دی گئی ہے .... سیتا .... لاجونتی .... ! اور سندرلال بابو نے رونا شروع کر دیا۔ رسالو اور نیکی رام نے تمام وہ نئے جھنڈے اٹھا لئے جن پر آج ہی سکول کے چھوکروں نے بڑی صفائی سے نعرے کاٹ کے چپکا دیئے تھے اور پھر وہ سب "سندرلال بابو زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے چل دیئے۔ جلوس میں سے ایک نے کہا ــــ

کو انکل کہتی ہے۔"

"اچھا" غضنفر نے کہا۔

ہاں جنوری میں اور تمہیں ایک لطیفہ سناؤں۔ جب تابندہ نگر اسٹیشن پر سر ذوالفقار کے سیلون میں سامان رکھا جانے لگا تو میں نے کہا کہ میم صاحب کا بچھونا پرائیویٹ سکریٹری والے ڈبے میں لگاؤ۔ وہ جلدی سے کہنے لگی "نہیں میں اور انکل ایک ہی کمرے میں سوتے ہیں۔"

غضنفر ہنسنے لگا۔ ہاں کیمرج میں بھی چل ذرا شوقین مزاج ہی تھی۔ ہم کہا بھی کرتے تھے تمہیں بجائے کیمرج کے آلڈرشاٹ میں رہنا چاہئے۔"

"تم اسے کیمرج کے زمانے سے جانتے ہو؟"

"ہاں"

شفیع نے گھڑی کی طرف دیکھا "ساڑھے سات" اور دونوں سبزے کے اس پار انڈیا گیسٹ سے ہوتے ہوئے گسٹ ہاؤس کی طرف مڑ گئے۔

تین چار روز بعد شفیع نے کہا "ہر ہائی نس آج اسے بھی بلوانا چاہتے ہیں۔"

"کسے؟" غضنفر نے پوچھا۔

"تمہاری اسی دوست چل کو۔ ذرا مہمانوں کو ٹیلیفون تو کر دو۔ سر جیرمی ایلس مین، سر ذوالفقار حسینی، مسز آر۔ کے نہرو۔ مسز روبن شتائن۔

"ہر ہائی نس کو معلوم ہے؟" غضنفر نے پوچھا۔

"نہیں، تم پوچھ آؤ" شفیع نے کہا۔

"ابھی تو وہ برآمد نہیں ہوئیں۔"

"خیر دوسروں کو تو ٹیلیفون کر دو۔"

اور جب ہر ہائی نس برآمد ہوئیں۔ گہرے سبز سلیک بال پیچھے کی طرف

مڑے ہوئے اور چہرہ پر کولڈ کریم۔ تو غضنفر نے فرشی سلام کے بعد عرض کیا "یور ہائی نس، ہز ہائی نس نے آج کے لنچ کے مہمانوں کی یہ فہرست بھیجی ہے۔"

اپنے لانبے نوکدار سُرخ ناخونوں سے فہرست غضنفر کے ہاتھ سے تقریباً کھینچ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی اپنی خواب گاہ میں چلی گئیں۔

"ٹمپریچر کتنا تھا؟" شفیع نے آہستہ سے پوچھا۔

"ابھی تو کچھ نہیں کہا جا سکتا" غضنفر نے جواب دیا اور ہز ہائی نس کی خوابگاہ کے پردے کی طرف اشارہ کیا۔

اسی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی اور چہرے پر بڑے ناگوار طنز کا تبسم لئے ہوئے ہز ہائی نس واپس آئیں۔ شفیع نے بو کیا اور ہٹ گیا۔ دو ناخونوں کی چٹکی سے کاغذ پکڑ کے ہز ہائی نس نے غضنفر کے ہاتھ میں دیا۔ اس پر مسز رُوبن شتائین کے نام پر گہری سرخ لکیر کھنچی ہوئی تھی۔

"پلیز غضنفر ہز ہائی نس سے کہہ دو کہ میری میز پر کسی وزیر کی ناجائز محبوبہ کے لئے کوئی مقام نہیں۔ چند نام اور فہرست میں بڑھا دو۔ مہارانی کوچ کلاں اور لیلا ..... تھینک یو ....." اور پھر اپنی لیڈی کمپینن کو بہت ہی مریل آواز میں پکارتی ہوئی وہ آگے کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں "جے نی ..... جے نی"۔

غضنفر نے فہرست شفیع کے ہاتھ میں دی اور کہا یہ تو ہز ہائی نس کا ارشاد ہے۔ اب تم ہز ہائی نس سے عرض کر دو۔

ہز ہائی نس ابھی ابھی باتھ روم سے آئے تھے۔ صرف ایک تولیہ باندھے چھوٹا سا قد، سینے پر بال۔ بے انتہا مظلوم معلوم ہوتے تھے۔ نواب مطمئن جنگ۔ کمر فرطِ مستعدی سے خمیدہ، اور ٹانگوں سے زاویہ قائمہ بناتی ہوئی ہز ہائینس

کے ہر فقرے پر یا تو بڑی سیاست سے مسکرا کے خاموش ہو جاتے یا جی قبلہ و پیر و مرشد" کہہ کر ہاتھ جوڑتے۔

"سب ریاستوں کو دیکھو نواب" ہز ہائی نس ارشاد فرما رہے تھے "سب جگہ نوجوان بادشاہ ہیں۔ رئیسوں کو پچاس پچپن سال سے زیادہ زندہ نہیں رہنا چاہیئے اور اپنے ولی عہدوں کے لئے جگہ خالی کر دینا چاہیئے"

نواب مطمئن جنگ بڑی شاطرانہ سیاست سے مسکرائے اور کوئی جواب نہ دیا۔ ایک اے، ڈی، سی نے البتہ ہاتھ جوڑ کے کہا "بجا ارشاد سرکار" لیکن مطمئن جنگ نے ادھر اُدھر گردن کو ذرا خم کر کے دیکھا معلوم نہیں ان بٹلروں اور آرڈرلیوں میں کتنے خان حضرت کے جاسوس ہیں۔

"بڈھا منحوس مرنے کا نام نہیں لیتا" ہز ہائی نس نے پاجامہ پہنتے پہنتے اپنی تقریر جاری رکھی۔ یہ ارشاد اپنے والد ماجد کے متعلق تھا "کیوں کیا خیال ہے نواب؟"

نواب مطمئن جنگ پھر اسی شاطرانہ مسکراہٹ کے بل پر بچ نکلنا چاہتے تھے۔ لیکن ہز ہائی نس نے اب کے تو ان سے براہ راست جواب طلب کیا تھا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر انھوں نے عرض کیا "قبلہ پیر و مرشد فارسی کی ایک مشہور مثل ہے: دیوار ہم گوش دارد، میں عرض کروں گا کہ سرکار کا فرمانا بالکل درست ہے لیکن ذرا احتیاط ....."

ایک آرڈرلی ہز ہائی نس کا ازار بند باندھ رہا تھا۔ دوسرا تن زیب کا کرتہ لئے کھڑا تھا کہ ہز ہائی نس اسے زیب تن فرمائیں۔ اتنے میں شفیع اندر آیا اور فوجی سلام کے بعد لنچ کی فہرست ہز ہائی نس کے سامنے بڑھا دی۔

"کیا ہے؟" ارشاد ہوا۔

"سر جیری رائس مین کو غضنفر نے ٹیلیفون کیا تھا اور شارٹ نوٹس کی معافی چاہی تھی۔ انھوں نے آج آنے سے معذرت کی ہے۔ کوئی اور انگیجمنٹ ہے۔" شفیع نے تمہید باندھی۔ وہ ایک دم سے جل روبن ٹشائن کے نام کے کاٹے جانے کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"خیر پروا نہیں۔ نواب میری طبیعت تو انگریزوں سے گھبراتی بھی ہے۔" قمیص میں گلا پھنساتے ہوئے ہز ہائی نس نے نواب مطہن جنگ سے کہا اور یہ واقعہ تھا جب کوئی بڑا انگریز مدعو ہوتا تو ہز ہائی نس پہلے ہی سے شکم سیر ہو کے دیسی کھانا کھا کے لنچ یا ڈنر پر جاتے اور وہاں صرف بصیغۂ مجبوری کچھ چکھ لیا کرتے تھے۔ چونکہ انگریزوں کی بہت اعلیٰ سطح کی گفتگو ان کی سمجھ میں نہ آتی اس لئے وہ ہمیشہ شکار کے موضوع پر آجاتے اور جب کوئی اور موضوع چھڑ جاتا تو بڑے لمبے چوڑے قہقہے لگاتے۔ مہمانوں کو گاڑی تک جا کے رخصت کرتے ان کا کوئی ذاتی آرڈرلی لائٹر جلاتا اور وہ سگار سلگاتے اور بڑے ہی خراب موڈ میں گالیاں بکتے ہوئے اپنے بیڈ روم چلے جاتے تھے۔

"قبلہ پیر و مرشد" نواب مطہن جنگ نے کہا۔ "انگریزوں سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں، وہ تو سرکار کی خوشامد کرتے ہوئے آتے ہیں۔ جب تک ان سے دوستی نہ ہوگی کیسے کام بنے گا۔ پیر و مرشد کو ایک دن تخت و تاج سنبھالنا ہی ہے۔"

میجر شفیع نے بڑی دل چسپی سے جوان سال "قبلہ پیر و مرشد" اور بڈھے "مرید" مطہن جنگ کو دیکھا۔ پیری اور مریدی کا کیا دل چسپ سلسلہ تھا۔ اور پھر عرض کیا۔

"سرکار ہز ہائنس نے مہارانی کوچ کلاں اور لیلا کا نام بڑھا دیا ہے۔"

"اس چھ ..... ال کا۔ نواب میں نے اپنی بیوی سے کتنا کہا۔

ان رنڈیوں سے دوستی مت بڑھاؤ۔ مہتاب جنگ نے تو دوسری شادی کر لی ہے۔ آج کل مہارانی کوچ کلاں کس کو رکھے ہوئے ہے؟"

یہ دیکھ کر کہ ہز ہائی نس کا موڈ ذرا ذرا ظرافت کی طرف مائل ہو رہا ہے میجر شفیع نے ہنس کر کہا: "سرکار کچھ دن ہوئے "ٹائمز آف انڈیا" میں ایک اشتہار آیا تھا۔ ضرورت ہے ایک جگولو کی۔ درخواستیں براہِ راست مہارانی کوچ کلاں کے پاس بھیجی جائیں۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔" ہز ہائی نس نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ سماں ہی بدل گیا نواب مطمئن جنگ بھی دیوار کا سہارا لے کر خوب ہنسے اور ہز ہائی نس نے خمیدہ پشت نواب صاحب سے کہا: "نواب کیا خیال ہے، ایک درخواست آپ بھی بھیج دیجیے۔"

اس پر ایک اور قہقہہ خود انھوں نے لگایا۔ نواب صاحب بھی مسکرائے۔
یہ دیکھ کر کہ موڈ ذرا ٹھیک ہے میجر شفیع نے عرض کی: "ہز ہائی نس نے جل روبن شتائن کا نام کاٹ دیا ہے۔"

یک لخت ہز ہائی نس کا موڈ بدل گیا۔ پہلے تو انھوں نے ہر ہائی نس کو ماں کی گالی دی اور نواب مطمئن جنگ سے کہا: "نواب ذرا آپ جا کے میری بیوی کو سمجھائیے۔ میں زبانی جل روبن شتائن کو سر کلاؤ آکن لک کے یہاں کاکٹیل پارٹی میں دعوت دے چکا ہوں۔ اس کا آنا ضروری ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"بجا قبلہ پیر و مرشد" نواب مطمئن جنگ نے طوفان کو ٹالنے کے لئے جلدی سے کہا: "میں ابھی ہر ہائینس کو سمجھا دوں گا۔"

ہر ہائی نس سے وہ لاونج میں ملے۔ فرشی سلام پر ہر ہائی نس نے ان سے بیٹھنے کے لئے کہا اور انھوں نے ذرا لمبی چوڑی تمہید باندھ کر ہر ہائی نس کو

راضی کر لیا۔

لنچ سے پہلے جب غضنفر برآمدے میں مہمانوں کا انتظار کر رہا تھا۔ نواب مطمئن جنگ نیلے لاونج سوٹ پر دستار باندھے (نئی دلی میں بھی دستار ان سے نہیں چھوٹتی تھی) آئے اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور پھر دستار اتار کے اپنا گنجا سر کھجاتے ہوئے انھوں نے غضنفر کو مخاطب کر کے ایک مصرعہ پڑھا۔

"کوہ کن گر سنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب"

ایک خنجر سا غضنفر کے جگر کے آر پار ہو گیا۔ سچ ہے دربار کی زندگی اس کے سوا اور کیا تھی۔ تعیش کے باسی پلاؤ کے چند سوکھے لقمے۔ اور پھر بھی یہی نواب مطمئن جنگ جو کسی آزاد ملک کے سفیر بڑی کامیابی سے بن سکتے تھے۔ اپنے ہر جملہ میں اپنے اَن پڑھ نوجوان آقا کو "قبلہ پیر و مرشد" کہتے تھے۔ یہاں دولت کی بارگاہ پر علم و فضل کی جبینیں بلا کچھ حاصل کئے۔ بلا فائدہ اٹھائے جھک جھک جاتی تھیں۔ ہز ہائی نس کو چار ہی دن پہلے سر جنگ بہادر نے "سرکار۔ سرکار" کہہ کے مخاطب کیا تھا۔ ایشیا کے جاگیر داری خمیر میں ابھی کتنی جان باقی تھی۔ ابھی کتنا جادو باقی تھا۔

ہز ہائی نس رو پہلے بیل بوٹوں سے بھری ہوئی سفید جگمگاتی ساڑھی اور سفید موتیوں کے ہار پہنے جلدی جلدی آئیں ان کے ہاتھ میں ٹیبل پلین تھا۔

"غضنفر..... یہ تم نے کیا کیا۔ خدا کے لئے جلدی سے بدلو۔ تم نے لیلا کو پرنسس لیلا آف کوچ کلاں لکھا ہے۔ یہ مہارانی کی بڑی توہین ہے۔ اسے مس لیلا مہتاب جنگ بنا دو۔ جلدی جلدی۔ جلدی، نیا کارڈ ٹائپ کروالو۔ خدا کا شکر ہے میری نگاہ پڑ گئی ورنہ کتنی مہمل قسم کی غلطی تھی..... پلیز نواب صاحب آپ بیٹھے رہئے..... تفیع سے کہئے جب تک کوئی

"پچھلے سال الہ آباد میں جرنلسٹوں کی کانفرنس ہوئی" سر شاہ بولے۔ "پنڈت جواہر لال اس کا افتتاح کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ مجھ سے کچھ اخبار نویس دوستوں نے کہا کہ سر شاہ، آپ کو ایک ڈنر دینا پڑے گا۔ میں نے دو ہزار روپے اس مد میں الگ کر دیئے۔ لیکن اسی رات ریڈیو سے مرکزی حکومت کا ایک آرڈیننس سنایا گیا کہ تیس سے زیادہ افراد کو کسی پارٹی میں نہیں بلایا جا سکتا اخبار نویس دو ڈھائی سو کے قریب تھے۔ ڈنر ملتوی کر دینا پڑا۔ لیکن ہم نے تو دو ہزار روپے دان کر دیئے تھے۔ اور دان دیدیا سو دیدیا۔ فکر ہوئی اس روپے کا کیا کیا جائے؟ پریاگ میں ہم جتنے دن بھی رہتے ہیں۔ تربینی کے اشنان کو ضرور جاتے ہیں۔ علی الصباح تربینی میں اشنان کر کے ہم نے جو بھگوان میں دھیان لگایا تو پریرنا[1] ہوئی کہ اس روپے کو ہم کملا نہرو ہسپتال کے لئے دے دیں۔ پنڈت جی تو الہ آباد میں تھے ہی۔ ہم نے دو ہزار کا چیک جیب میں ڈالا۔ اور آنند بھون پہنچے۔

پنڈت جی اندر مصروف تھے۔ کئی لوگ باہر ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ بیٹھے بیٹھے جب ہم کو آدھ گھنٹہ ہو گیا۔ تو ہم نے پوچھ گچھ کی اور ایک صاحب کو جو بار بار اندر باہر جاتے آتے تھے اور جن کے متعلق معلوم ہوا کہ پنڈت جی کے سکریٹری ہیں اپنا نام دیا۔

سکریٹری صاحب نے کہا "آپ بیٹھئے، میں ابھی آپ کا نام اندر دیتا ہوں"۔ اور وہ اندر چلے گئے۔ آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ جب وہ پھر آئے تو ہم نے چیک نکال کر ان کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ ہمیں تو محض یہ دان دینا تھا اور

---

[1] پریرنا۔ تحریک (الہام کے معنوں میں استعمال ہوا ہے)

کوئی کام نہیں۔ آپ یہ چیک پنڈت جی کے ہاتھ میں دے دیجئے گا۔ ہم جاتے ہیں۔

یہ سُن کر سکریٹری صاحب نے ہاتھ جوڑے۔ ہم نے کہا کہ پانچ منٹ ہم اور تکلیف کریں اور وہ چیک لئے ہوئے اندر چلے گئے۔

چند لمحوں بعد واقعی پنڈت جی دروازے میں نظر آئے۔ سب لوگ گھبرا کر اُٹھے۔ مگر وہ پورے اٹھ بھی نہ پائے تھے کہ ایک خفیف سے تبسم کے ساتھ، جو نہ جانے کس کے لئے تھا، پنڈت جی نے کسی مخصوص فرد کی طرف دیکھے بغیر انگریزی میں کہا: "آپ لوگوں سے ملاقات ہی نہ ہوسکی"۔ ذرا اور مسکرائے اور جیسے نمودار ہوئے تھے ویسے ہی غائب ہوگئے۔

بلراج قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ نردوتم بھی خاموش نہ رہ سکا۔ ڈاکٹر بوس نے، جو اس کہانی کا ایک ایک لفظ پی رہے تھے۔ حیرت سے یہ ظاہر کرتے ہوئے کھیسیں نکوس دیں کہ دیکھئے دنیا کیا سے کیا ہوگئی ہے۔

سر شاہ ہاہا ہا، اور پھر ہی ہی ہی، کر کے ہنسے، لیکن اس ہنسی میں عجیب سی کھسیاہٹ تھی۔ پھر نردوتم نے کہا: "آپ بھی سر شاہ کن ناشکروں کو دان دیتے ہیں آپ کو مصرا ایسے آرٹسٹوں کی امداد کرنی چاہئے۔ اس کے عوض آپ ایک پورٹریٹ Portrait بھی پاجائیں تو اس کی قیمت کبھی ہزاروں لاکھوں ہوسکتی ہے"۔

"اچھا تو آپ پورٹریٹ بھی بناتے ہیں"۔ سر شاہ ہنسے "ہاہا ہا، خوب خوب، ہی ہی ہی"۔

ڈاکٹر بوس بھی اپنے خواب سے چونکے اور انھیں اپنے فرض کا احساس ہوا۔ "پورٹریٹ پینٹنگ میں مصرا ایک دم اکسپرٹ ہے"۔ انھوں نے میری

پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "وہ دیکھئے سامنے لگی ہوئی مزدور کی تصویر۔ اس نے پانچ منٹ میں بنائی ہے۔ آپ نے میرے ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی میری تصویر نہیں دیکھی۔ وہ بھی اسی کی بنائی ہوئی ہے" اور انھوں نے شاباشی کے طور پر پھر میری پیٹھ تھپتھپا دی۔

سر موصوف نے ان کا اشارہ نہیں سمجھا۔ یا سمجھ کر بھی ٹال گئے۔ انھوں نے کلائی میں لگی ہوئی گھڑی دیکھی، چائے کا آخری گھونٹ لیا اور ڈاکٹر بوس کے جواب میں ہا ہا ہا، خوب خوب، ہی ہی ہی کر دیا۔

میں سچ کہتا ہوں تر پاٹھی، ندامت سے میری گردن جھک گئی۔ میں نے اپنے آپ کو اس لڑکی سا محسوس کیا۔ جس کو دیکھنے والے لگ آئے ہوں۔ اپنی پسند یا ناپسند کے بارے میں کچھ بھی اشارہ نہ کر رہے ہوں اور جس کے سرپرست کبھی اس کی ایک خوبی کی تعریف کر رہے ہوں اور کبھی دوسری کی اور وہ لڑکی احساسِ ندامت سے مرتی جائے۔

چائے پی کر سب اُٹھے۔ باہر کے دروازے کے دونوں طرف اندر کی جانب، میں نے اجنتا کی دو تصویریں بنا رکھی ہیں۔ تم نے بھی جن کی بارہا تعریف کی ہے۔ ایک لمحے کے لئے سر شاہ کی نظر ان دوشیزاؤں کے نیم عریاں گداز جسموں اور ان کے خطوط پر گئی۔ اسی وقت ڈاکٹر بوس نے کہا۔ "سر شاہ، یہ دونوں تصویریں تو آپ کے ڈرائینگ روم میں ہونی چاہئیں۔ اسی طرح دروازے کے دونوں جانب! مصر اسے کہئے کہ عمدہ کپڑے پر انھیں بنالے۔ اجنتا کا آرٹ ہے یہ۔"

"ہا ہا ہا، اجنتا کا آرٹ تو ہمارے گھر ہی میں ہے۔ ہی ہی ہی" سر شاہ نے باہر نکلتے ہوئے کہا "میرے لڑکے کی سسرال ہے وہاں! ہا ہا ہا

"..... ہی ہی ہی ....."

اس وقت اپنی اس کوشش کی ناکامی پر اگرچہ ہمارے سب کے چہرے اتر گئے تھے، لیکن سب ہی سر شاہ کی اس بات پر ہا ہا ہا، ہی ہی ہی کر اُٹھے۔ جب سر موصوف، ان کے صاحبزادے اور ڈاکٹر بوس موٹر میں سوار ہو گئے اور موٹر چلی گئی تو بلراج نے چڑھ کر کہا۔

"یہ سب اپنے مطلب کے دانی ہیں ـــ ان کے دان اور فن کی سرپرستی میں ان کی ذاتی اغراض پوشیدہ رہتی ہیں۔ تم ٹھہرے گمنام آرٹسٹ، تمہاری سرپرستی سے انھیں کیا فائدہ؟"

میں خاموش رہا۔ اپنے ان دوستوں پر مجھے بے حد غصہ آیا۔ جنھوں نے مجھے اپنے سیدھے راستے سے ہٹا کر ایسی اذیت بخش پوزیشن میں ڈال دیا۔ اسی وقت تمہاری یاد بھی آئی۔ کیونکہ دراصل اس صورت حالات کی ذمہ داری تمہیں پر ہے۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ ایسی بات نہیں۔ جو دوسرے کے کہنے پر کنوئیں میں چھلانگ لگا دے۔ اس سے بڑا احمق اور کون ہو سکتا ہے۔ خیر، اس تلخ تجربے سے یہ بات تو سمجھ میں آگئی کہ آرٹسٹ کو اس سماج اور اس کے ستونوں یعنی سرمایہ داروں سے سرپرستی کی توقع نہ کرنی چاہیے۔ اس کی قدر اور سرپرستی یہ سڑا گلا سماج اور اس کے کھوکھلے ستون نہ کر سکیں گے۔

تمہارا آنند کمار مصرا

ابھی جب میں یہ خط لفافے میں بند کرنے جا رہا تھا۔ ڈاکٹر بوس کا ایک نوٹ ملا ہے کہ سر شاہ میرے فن سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ میں پنڈت جواہر لال کی ایک خوبصورت تصویر بنا دوں۔ تو وہ اسے ان کی سالگرہ

"مہاستی سیتا زندہ باد" ایک طرف سے آواز آئی "شری رام چندر......"

اور پھر بہت سی آوازیں آئیں "خاموش! خاموش!" اور نارائن باوا کی مہینوں کی کتھا کارت چلی گئی۔ بہت سے لوگ جلوس میں شامل ہو گئے۔ جس کے آگے آگے وکیل کالکا پرشاد اور حکم سنگھ محرر، چوکی کلاں جا رہے تھے اپنی بوڑھی چھڑی کو .... پٹ پٹ زمین پر مارتے ...... اور ایک فاتحانہ سی آواز پیدا کرتے ہوئے — اور ان کے درمیان کہیں سندر لال جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ابھی آنسو بہہ رہے تھے آج اس کے دل کو بڑی ٹھیس لگی تھی اور لوگ بڑے جوش کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گا رہے تھے۔

"ہتھ لائیاں کملان نی، لاجونتی دے بوٹے ....."

ابھی گیت کی آوازیں لوگوں کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ صبح بھی نہیں ہو پائی تھی اور محلہ ملا شکور کے مکان ۴۱۴ کی بدھوا ابھی تک اپنے بستر میں کربناک سی انگڑائیاں لے رہی تھی کہ سندر لال کا "گرائیں" لال چند جسے اثر اور رسوخ استعمال کر کے سندر لال اور خلیفہ کالکا پرشاد نے راشن ڈپو لے دیا تھا دوڑا دوڑا آیا.... اور اپنے گاڑھے کی چادر سے ہاتھ پھیلائے ہوئے بولا۔

"بدھائی ہو سندر لال"

سندر لال نے میٹھا گڑ چلم میں رکھتے ہوئے کہا "کس بات کی بدھائی لال چند؟"

"میں نے لاجو بھابی کو دیکھا ہے"

سندر لال کے ہاتھ سے چلم گر گئی اور میٹھا تمباکو فرش پر گر گیا —"کہاں سے دیکھا ہے؟" اس نے لال چند کے شانے ہلاتے ہوئے پوچھا اور جلد جواب نہ پانے پر جھنجوڑ دیا۔

"واگہ کی سرحد پر"

پر ان کے حضور میں تحفہ کے طور پر پیش کر دیں۔ ڈاکٹر بوس نے اس کامیابی پر مجھے مبارکباد دی ہے اور لکھا ہے کہ میری قسمت چمکنے میں اب دیر نہیں۔ سر شاہ پنڈت جی کی کچھ تصویریں بھیجیں گے۔ ان میں سے جو سب سے اچھی ہو اسے چن کر میں ایک بہت عمدہ رنگین شبیہ تیار کر دوں۔

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں معاوضہ کی فکر نہ کروں۔ سر شاہ فن کے بڑے نقاد ہیں۔ تصویر انھیں پسند آگئی تو وہ اتنے دام دیں گے کہ میرے لئے جائے شکایت نہ رہے گی۔

جی میں تو آتا ہے۔ لکھ دوں کہ وہ فن کے جتنے بڑے قدر دان ہیں، میں بخوبی جان گیا ہوں۔ مگر سوچتا ہوں کہ خاموش رہ جاؤں۔ کوئی دوسرا فن کار شہرت یا اجرت کے عوض خواہ دن بھر بھینس کے آگے بین بجاتا رہے۔ لیکن مصور کے لئے ایسا کرنا ناممکن ہے۔

عزیز احمد

کٹھ پتلیاں

اس نے پھر ٹیلیفون کیا اور ٹیلیفون پر پھر وہی قہقہوں کا سیلاب آیا۔ "کون ؟ گز؟ (وہ غضنفر کو آکسفورڈ کے زمانے سے گز کہا کرتی تھی) تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ یہاں ؟ پور بوائے۔ کہاں ٹھہرے ہو۔ امپریل۔ ہاں۔ ہاں۔ ضرور ضرور آؤ۔ سنو۔ آج شام کو کچھ کام ہے ؟ تو پھر ڈرنکس کے لئے آؤ۔ نِک ؟ نِک دورہ کرتے ڈیرہ اسمٰعیل خاں گئے ہوئے ہیں۔ تمہیں مکان مل جائے گا ؟ ..... اچھا شام کو چھ بجے کے قریب۔"

غضنفر نے آہستہ سے ٹیلیفون کا ریسیور رکھا۔ سامنے فیروز پور کی وہی دونوں خوش پوش منیجر سے کسی چیز کی فرمائش کر رہی تھیں۔ کھانے کے کمرے میں لاتری ویاتا کا خون کیا جا رہا تھا۔ جی چاہتا تھا دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی جائیں۔

"اولڈ جل" اس نے پتلون کی جیب میں ہاتھ گھسیڑے اور جل کا خیال

کر کے مسکراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔

جل کو وہ کیمرج کے زمانے سے جانتا تھا۔ اب تک وہ اسنیپ کہیں پڑا تھا جس میں کنگس کالج کے پھاٹک میں کھڑے ہو کے اس نے، جل نے اور روبن شتائن نے تصویر کھنچوائی تھی۔ تصویر میں اس کا موٹا، سبز، اونی کوٹ بڑا ڈھیلا ڈھالا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بالکل حاملہ معلوم ہو رہی تھی۔ حالانکہ بیچاری خیر فرشتہ تو وہ اس زمانے میں بھی نہیں تھی۔ ابھی تک کین روبن شتائن سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ وسطِ یورپ سے کیوں انگلستان خصوصاً کیمرج آئی ہے۔ کیونکہ یونیورسٹی سے جل کو کوئی خاص واسطہ نہیں تھا۔ مگر اس سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں وہ انگریزی بالکل انگریزوں کے لہجے میں بولنے لگی تھی لیکن اس کے آداب اور اخلاق وسطِ یورپ ہی کے تھے۔ کچھ وی آنا اور کچھ بُوداپست۔ وی آنا زیادہ اور بُوداپست کم۔

فِشر باستائی سے بُوداپست کے دوسرے سرے تک چاندنی راتوں میں کشتی دو چکر کرتی تھی۔ ایک رات کے آٹھ بجے سے دس بجے۔ دوسرا چکر دس بجے سے بارہ بجے تک۔ ایک طرف بودا اور ترکوں کی یلغار اور قرونِ وسطیٰ اور دوسری طرف پست اور ہاپس بُرگوں کا آخری زمانہ اور بیسویں صدی۔ روبن شتائن نے اسی کشتی پر دس سے بارہ بجے تک والے چکر میں جل کے ساتھ وی آنا کا والتس ناچتے ناچتے کہا تھا "سرت لک" ہنگری زبان کے یہی دو لفظ اسے یاد تھے۔ اور الفاظ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جل کی روح جرمن تھی، صدفی صد آسٹریائی۔ اس نے چڑ کے کہا "ہنگروی میں تو مجھ سے عاشقی مت کرو"۔ اور تھوڑی دیر کے بعد جذبات کی رَو میں وہ بھی بہہ گئی۔ چاندنی میں سبزی

سے ڈھکا ہوا ڈینیوب کے بیچوں بیچ "جزیرہ مارگرت" تھا۔ خوابوں کی پامال دنیا لیکن ماریا تھریسا کی یاد نس نس میں دوڑ گئی۔ ڈینیوب نیلی نہ سہی، گدلی سہی چاندنی رات میں ملگجی سہی لیکن مارگرت انزل کے پاس تو چاندنی جادو سا کرتی معلوم ہوتی تھی اور چھوٹے سے بینڈ کے سامنے کھڑے ہو کر کسی نے گانا شروع کیا۔

"ملکہ
حسین ملکہ
وہ صرف ملکہ نہیں
عورت بھی ہے"

کئی سال پہلے کا وہی آنا اور بودا اپست پھر سے زندہ ہو گیا۔ اس دریا کی روانی میں جو ان دو شہروں کو ملاتا ہے۔ وسطِ یورپ رومان اور گیتوں کی شاہراہ۔

اس رات روبن شتائن نے پرپوز کیا اور جل نے مان لیا۔

"بالکل اس طرح"۔ روبن شتائن نے چٹکی بجا کے غضنفر کو سمجھایا۔

"اس طرح"! جل نے بھی چٹکی بجائی۔

تعطیلات کے زمانے کے حالات جو ہنی مون کے زمانے کے حالات تھے روبن شتائن نے سنانے شروع کئے۔

اور پھر کئی سال گزر گئے۔ مارچ کی ایک شام تھی۔ ہواؤں کی خنکی ذرا کم کم ہو گئی تھی۔ یہ ہوائیں پرانے قلعہ کو تو زیب دیتی تھیں لیکن نئی دلّی کے اس طویل و عریض سبزے پر جو مہاراجاؤں کے محلوں سے شروع ہو کے امپریل سکریٹریٹ کے قریب ختم ہوتا تھا جس کی آبیاری کے لئے وہ نہریں پھر سے

جاری کی گئی تھیں جو صدیوں پہلے چاندنی چوک میں خشک ہو چکی تھیں۔ اس سبزے پر یہ ہوا ذرا غیر سی معلوم ہوتی، اجنبی اور ناگوار۔ ابھی تو مارچ ہی کا موسم تھا۔ اتنی جلدی گرمی کو ذرا سی بھی جھلک دکھانے کا کیا حق حاصل تھا۔ ابھی تو چھ مہینے پڑے تھے۔

انڈیا گیٹ سے آگے سبزے کے کنارے ٹہلتے ٹہلتے یہ دونوں چلے جا رہے تھے۔ غضنفر اور شفیع ایک جگہ ٹوٹے ہوئے بام و در نے سنایا بھی۔ ان فرنگیوں کو حکومت کرنا کیا خاک آئے گا۔ یہاں مغلوں نے حکومت کی ہے۔

شفیع نے گھڑی دیکھی۔ "سوا سات، ڈنر تو ساڑھے آٹھ سے ہے نا؟ اطمینان سے کپڑے بدل سکتے ہیں۔"

"میں سوچ رہا تھا کہ مغلوں کے زمانے میں دلّی لاکھ شاندار رہی ہو۔ طبعی زندگی بسر کرنے کا ہنر یورپ والوں ہی کو آتا ہے۔ اسی سبزے کو دیکھئے نا۔ اس کی کشادگی کو یہ نہیں کہ ذرا سے علاقے میں سرو کے یا چنار کے ہزار درخت لگا دیئے ہوں۔ ....."

"ہاں۔" شفیع نے پان چباتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

دفعتاً غضنفر نے آنکھیں پھاڑ کے سامنے دیکھا۔ یہ تو جل تھی ایک آنریبل ممبر کے ساتھ۔

بے اختیار غضنفر کی زبان سے نکل گیا۔ "جل، جل تم یہاں کہاں؟"

جل ہلو کہہ کے تصنع سے مسکرائی۔ جلدی سے آنریبل ممبر سے اس کا تعارف کرایا۔ شفیع کی طرف دیکھ کے سر ہلایا۔ معذرت کی اور چلدی۔

"اچھا تو یہ بات تھی۔" غضنفر نے اپنے آپ سے ذرا بلند آواز سے کہا۔

شفیع ہنسنے لگا۔ "یہاں یہ کچھ عرصے سے ہے تمہیں معلوم نہیں تھا؟ ذوالفقار حسینی کی سکریٹری ہے۔ فرخندہ نگر بھی آئی تھی ان ہی کے ساتھ۔ ذوالفقار حسینی

کو انکل کہتی ہے۔"

"اچھا" غضنفر نے کہا۔

ہاں جنوری میں اور تمہیں ایک لطیفہ سناؤں۔ جب تابندہ نگر اسٹیشن پر سر ذوالفقار کے سیلون میں سامان رکھا جانے لگا تو میں نے کہا کہ میم صاحب کا بچھونا پرائیویٹ سکریٹری والے ڈبے میں لگاؤ۔ وہ جلدی سے کہنے لگی "نہیں میں اور انکل ایک ہی کمرے میں سوتے ہیں۔"

غضنفر ہنسنے لگا۔ ہاں کیمرج میں بھی جل ذرا شوقین مزاج ہی تھی۔ ہم کہا بھی کرتے تھے تمہیں بجائے کیمرج کے آلڈرشاٹ میں رہنا چاہیئے۔"

"تم اسے کیمرج کے زمانے سے جانتے ہو؟"

"ہاں"

شفیع نے گھڑی کی طرف دیکھا "ساڑھے سات" اور دونوں سبزے کے اس پار انڈیا گیٹ سے ہوتے ہوئے گسٹ ہاؤس کی طرف مڑ گئے۔

تین چار روز بعد شفیع نے کہا "ہز ہائی نس آج اسے بھی بلوانا چاہتے ہیں۔"

"کسے؟" غضنفر نے پوچھا۔

"تمہاری اسی دوست جل کو۔ ذرا مہمانوں کو ٹیلیفون تو کر دو۔ سر جیرمی ایس مین، سر ذوالفقار حسینی، مسز آر۔ کے نہرو۔ مسز روبن شتائین۔"

"ہز ہائی نس کو معلوم ہے؟" غضنفر نے پوچھا۔

"نہیں، تم پوچھ آؤ" شفیع نے کہا۔

"ابھی تو وہ برآمد نہیں ہوئیں۔"

"خیر دوسروں کو تو ٹیلیفون کر دو۔"

اور جب ہز ہائی نس برآمد ہوئیں۔ گہرے سبز سلیک بال پیچھے کی طرف

مڑے ہوئے اور چہرہ پر کولڈ کریم۔ تو غضنفر نے فرشی سلام کے بعد عرض کیا "یور ہائی نس، ہز ہائی نس نے آج کے لنچ کے مہمانوں کی یہ فہرست بھیجی ہے"۔

اپنے لانبے نوکدار سُرخ ناخونوں سے فہرست غضنفر کے ہاتھ سے تقریباً کھینچ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی اپنی خواب گاہ میں چلی گئیں۔

"ٹمپر کتنا تھا؟" شفیع نے آہستہ سے پوچھا۔

"ابھی تو کچھ نہیں کہا جا سکتا" غضنفر نے جواب دیا اور ہز ہائی نس کی خوابگاہ کے پردے کی طرف اشارہ کیا۔

اسی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی اور چہرے پر بڑے ناگوار طنز کا تبسم لئے ہوئے ہز ہائی نس واپس آئیں۔ شفیع نے بو کیا اور ہٹ گیا۔ دو ناخونوں کی چٹکی سے کاغذ پکڑ کے ہز ہائی نس نے غضنفر کے ہاتھ میں دیا۔ اس پر مسز رُوبن شتائن کے نام پر گہری سرخ لکیر کھنچی ہوئی تھی۔

"پلیز غضنفر ہز ہائی نس سے کہہ دو کہ میری میز پر کسی وزیر کی ناجائز محبوبہ کے لئے کوئی مقام نہیں۔ چند نام اور فہرست میں بڑھا دو۔ مہارانی کوچ کلاں اور لیلا ..... تھینک یو ....." اور پھر اپنی لیڈی کمپینن کو بہت ہی مریل آواز میں پکارتی ہوئی وہ آگے کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں "جے نی ..... جے نی"۔

غضنفر نے فہرست شفیع کے ہاتھ میں دی اور کہا یہ تو ہز ہائی نس کا ارشاد ہے۔ اب تم ہز ہائی نس سے عرض کر دو۔

ہز ہائی نس ابھی ابھی باتھ روم سے آئے تھے۔ صرف ایک تولیہ باندھے چھوٹا سا قد، سینے پر بال۔ بے انتہا مظلوم معلوم ہوتے تھے۔ نواب مطمئن جنگ۔ کمر فرط مستعدی سے خمیدہ، اور ٹانگوں سے زاویہ قائمہ بناتی ہوئی ہز ہائینس

کے ہر فقرے پر یا تو بڑی سیاست سے مسکرا کے خاموش ہو جاتے یا جی قبلہ و پیر و مرشد" کہہ کر ہاتھ جوڑتے۔

"سب ریاستوں کو دیکھو نواب" ہز ہائی نس ارشاد فرما رہے تھے "سب جگہ نوجوان بادشاہ ہیں۔ رئیسوں کو پچاس پچپن سال سے زیادہ زندہ نہیں رہنا چاہئے اور اپنے ولی عہدوں کے لئے جگہ خالی کر دینا چاہئے"

نواب مطمئن جنگ بڑی شاطرانہ سیاست سے مسکرائے اور کوئی جواب نہ دیا۔ ایک اے ڈی سی نے البتہ ہاتھ جوڑ کے کہا "بجا ارشاد سرکار" لیکن مطمئن جنگ نے اِدھر اُدھر گردن کو ذرا خم کر کے دیکھا معلوم نہیں ان بٹلروں اور آرڈرلیوں میں کتنے خان حضرت کے جاسوس ہیں۔

"بڈھا منحوس مرنے کا نام نہیں لیتا" ہز ہائی نس نے پاجامہ پہنتے پہنتے اپنی تقریر جاری رکھی۔ یہ ارشاد اپنے والد ماجد کے متعلق تھا "کیوں کیا خیال ہے نواب؟"

نواب مطمئن جنگ پھر اسی شاطرانہ مسکراہٹ کے بل پر بچ نکلنا چاہتے تھے۔ لیکن ہز ہائی نس نے اب کے تو ان سے براہ راست جواب طلب کیا تھا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر انھوں نے عرض کیا "قبلہ پیر و مرشد فارسی کی ایک مشہور مثل ہے "دیوار ہم گوش دارد" میں عرض کروں گا کہ سرکار کا فرمانا بالکل درست ہے لیکن ذرا احتیاط ....."

ایک آرڈرلی ہز ہائی نس کا ازار بند باندھ رہا تھا۔ دوسرا تن زیب کا کرتہ لئے کھڑا تھا کہ ہز ہائی نس اسے زیب تن فرمائیں۔ اتنے میں شفیع اندر آیا اور فوجی سلام کے بعد لنچ کی فہرست ہز ہائی نس کے سامنے بڑھا دی۔

"کیا ہے؟" ارشاد ہوا۔

"سر جیرمی رائس مین کو غضنفر نے ٹیلیفون کیا تھا اور شارٹ نوٹس کی معافی چاہی تھی۔ انھوں نے آج آنے سے معذرت کی ہے۔ کوئی اور انگیجمنٹ ہے۔" شفیع نے تمہید باندھی۔ وہ ایک دم سے جل روبن شتائن کے نام کے کاٹے جانے کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"خیر پروا نہیں۔ نواب میری طبیعت تو انگریزوں سے گھبراتی بھی ہے۔" قمیص میں گلا پھنساتے ہوئے ہز ہائی نس نے نواب معظمین جنگ سے کہا اور یہ واقعہ تھا جب کوئی بڑا انگریز مدعو ہوتا تو ہز ہائی نس پہلے ہی سے شکم سیر ہو کے دیسی کھانا کھا کے لنچ یا ڈنر پر جاتے اور وہاں صرف بصیغۂ مجبوری کچھ چکھ لیا کرتے تھے۔ چونکہ انگریزوں کی بہت اعلیٰ سطح کی گفتگو ان کی سمجھ میں نہ آتی اس لئے وہ ہمیشہ شکار کے موضوع پر آجاتے اور جب کوئی اور موضوع چھڑ جاتا تو بڑے لمبے چوڑے قہقہے لگاتے۔ مہمانوں کو گاڑی تک جا کے رخصت کرتے ان کا کوئی ذاتی آرڈرلی لائٹر جلاتا اور وہ سگار سلگاتے اور بڑے ہی خراب موڈ میں گالیاں بکتے ہوئے اپنے بیڈ روم چلے جاتے تھے۔

"قبلہ پیر و مرشد" نواب معظمین جنگ نے کہا۔ "انگریزوں سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں، وہ تو سرکار کی خوشامد کرتے ہوئے آتے ہیں۔ جب تک ان سے دوستی نہ ہو گی کیسے کام بنے گا۔ پیر و مرشد کو ایک دن تخت و تاج سنبھالنا ہے۔"

میجر شفیع نے بڑی دل چسپی سے جوان سال "قبلہ پیر و مرشد" اور بڈھے "مرید" معظمین جنگ کو دیکھا۔ پیری اور مریدی کا کیا دل چسپ سلسلہ تھا۔ اور پھر عرض کیا۔

"سرکار ہز ہائنس نے مہارانی کوچ کلاں اور لیلا کا نام بڑھا دیا ہے۔"

"اس چھ ..... ال کا۔ نواب میں نے اپنی بیوی سے کتنا کہا۔

ان رنڈیوں سے دوستی مت بڑھاؤ۔ مہتاب جنگ نے تو دوسری شادی کر لی ہے۔ آج کل مہارانی کوچ کلاں کس کو رکھے ہوئے ہے؟"

یہ دیکھ کر کہ ہز ہائی نس کا موڈ ذرا ذرا ظرافت کی طرف مائل ہو رہا ہے میجر شفیع نے ہنس کر کہا۔ "سرکار کچھ دن ہوئے ٹائمز آف انڈیا میں ایک اشتہار آیا تھا۔ ضرورت ہے ایک جگو لوکی۔ درخواستیں براہِ راست مہارانی کوچ کلاں کے پاس بھیجی جائیں۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔" ہز ہائی نس نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ سماں ہی بدل گیا نواب مطیعن جنگ بھی دیوار کا سہارا لے کر خوب ہنسے اور ہز ہائی نس نے خمیدہ پشت نواب صاحب سے کہا۔ "نواب کیا خیال ہے، ایک درخواست آپ بھی بھیج دیجئے۔"

اس پر ایک اور قہقہہ خود انھوں نے لگایا۔ نواب صاحب بھی مسکرائے۔

یہ دیکھ کر کہ موڈ ذرا ٹھیک ہے میجر شفیع نے عرض کی۔ "ہز ہائی نس نے جل روبن شتائن کا نام کاٹ دیا ہے۔"

یک لخت ہز ہائی نس کا موڈ بدل گیا۔ پہلے تو انھوں نے ہز ہائی نس کو ماں کی گالی دی اور نواب مطیعن جنگ سے کہا۔ "نواب ذرا آپ جا کے میری بیوی کو سمجھا دیجئے۔ میں زبانی جل روبن شتائن کو سر کلاؤ آکن لک کے یہاں کاک ٹیل پارٹی میں دعوت دے چکا ہوں۔ اس کا آنا ضروری ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"بجا قبلہ پیر و مرشد۔" نواب مطیعن جنگ نے طوفان کو ٹالنے کے لئے جلدی سے کہا۔ "میں ابھی ہز ہائی نس کو سمجھا دوں گا۔"

ہز ہائی نس سے وہ لاونج میں ملے۔ فرشی سلام پر ہز ہائی نس نے ان سے بیٹھنے کے لئے کہا اور انھوں نے ذرا لمبی چوڑی تمہید باندھ کر ہز ہائی نس کو

سندر لال نے لال چند کو چھوڑ دیا اور اتنا سا بولا "کوئی اور ہوگی"

لال چند نے یقین دلاتے ہوئے کہا "نہیں بھیا وہ لاجو ہی تھی لاجو ....."

"تم اسے پہچانتے بھی ہو؟" سندر لال نے پھر سے میٹھے تمباکو کو فرش پر سے اُٹھاتے اور ہتھیلی پر مسلتے ہوئے پوچھا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے رسالو کی چلم حقے پر سے اُٹھائی اور بولا "بھلا کیا پہچان ہے اُس کی؟"

"ایک تیندولہ ٹھوڑی پر ہے" ——— دوسرا گال پر ———"

"ہاں ہاں ہاں" اور سندر لال نے خود ہی کہہ دیا "تیسرا ماتھے پر" وہ نہیں چاہتا تھا اب کوئی خدشہ رہ جائے اور ایک دم اسے لاجونتی کے جانے پہچانے جسم کے سارے تیندولے یاد آگئے جو اس نے بچپنے میں اپنے جسم پر بنوائے تھے جو ان ہلکے ہلکے سبز دانوں کی مانند تھے جو چھوئی موئی کے پودے کے بدن پر ہوتے ہیں اور جن کی طرف اشارہ کرتے ہی وہ پودا مرجھانے لگتا ہے بالکل اسی طرح ان تیندولوں کی طرف انگلی کرتے ہی لاجونتی شرما جاتی تھی ——— اور گم ہو جاتی تھی اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی، گویا اس کے سب راز کسی کو معلوم ہو گئے ہوں اور کسی نامعلوم خزانے کے لٹ جانے سے وہ مفلس ہو گئی ہو ..... اور ..... سندر لال کا سارا جسم ایک اَن جانے خوف، ایک اَن جانی محبت اور اس کی مقدس آگ سے پھنکنے لگا اس نے پھر سے لال چند کو پکڑ لیا اور پوچھا .....

"لاجو واگہ کیسے پہونچ گئی؟"

لال چند نے کہا "ہند اور پاکستان میں عورتوں کا تبادلہ ہو رہا تھا نا"

"پھر کیا ہوا؟ ——— سندر لال نے اکڑوں بیٹھے ہوئے کہا "کیا ہوا پھر؟"

رسالو بھی اپنی چارپائی پر اٹھ بیٹھا اور تمباکو نوشوں کی مخصوص کھانسی کھانستے

راضی کر لیا۔

لنچ سے پہلے جب غضنفر برآمدے میں مہمانوں کا انتظار کر رہا تھا۔ نواب مطمئن جنگ نیلے لاونج سوٹ پر دستار باندھے (نئی دلی میں بھی دستار ان سے نہیں چھوٹتی تھی) آئے اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور پھر دستار اتار کے اپنا گنجا سر کھجاتے ہوئے انھوں نے غضنفر کو مخاطب کر کے ایک مصرعہ پڑھا۔

"کوہ کن گر سنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب"

ایک خنجر سا غضنفر کے جگر کے آر پار ہو گیا۔ سچ ہے دربار کی زندگی اس کے سوا اور کیا تھی۔ تعیش کے باسی پلاؤ کے چند سوکھے لقمے۔ اور پھر بھی یہی نواب مطمئن جنگ جو کسی آزاد ملک کے سفیر بڑی کامیابی سے بن سکتے تھے۔ اپنے ہر جملہ میں اپنے اَن پڑھ نوجوان آقا کو "قبلہ پیر و مرشد" کہتے تھے۔ یہاں دولت کی بارگاہ پر علم و فضل کی جبینیں بلا کچھ حاصل کئے۔ بلا فائدہ اٹھائے جھک جھک جاتی تھیں۔ ہز ہائی نس کو چار ہی دن پہلے سر جنگ بہادر نے "سرکار۔ سرکار" کہہ کے مخاطب کیا تھا۔ ایشیا کے جاگیر داری خمیر میں ابھی کتنی جان باقی تھی۔ ابھی کتنا جادو باقی تھا۔

ہز ہائی نس رد پہلے بیل بوٹوں سے بھری ہوئی سفید جگمگاتی ساڑھی اور سفید موتیوں کے ہار پہنے جلدی جلدی آئیں ان کے ہاتھ میں ٹیبل پلین تھا۔

"غضنفر..... یہ تم نے کیا کیا۔ خدا کے لئے جلدی سے بدلو۔ تم نے لیلا کو پرنسس لیلا آف کوچ کلاں لکھا ہے۔ یہ مہارانی کی بڑی توہین ہے۔ اسے مس لیلا مہتاب جنگ بنا دو۔ جلدی جلدی۔ جلدی، نیا کارڈ ٹائپ کروالو۔ خدا کا شکر ہے میری نگاہ پڑ گئی ورنہ کتنی مہل قسم کی غلطی تھی..... پلیز نواب صاحب آپ بیٹھے رہئے..... شفیع سے کہئے جب تک کوئی

جہاں آئیں وہ انھیں ریسو کرے۔"

ساڑھی میں ہز ہائی نس سے لمبے لمبے ڈگ نہیں بھرے جاتے تھے۔ ان کے لمبے رعب دار قد پر ساڑھی شاہانہ ملبوس ضرور معلوم ہوتی تھی۔ لیکن وہ تیزی سے اندر چلی گئیں اور غضنفر نے ٹائپسٹ کو لیلا کا نام بدلنے کے لئے بلا بھیجا۔ "نواب صاحب مجھے نہیں معلوم تھا کہ حرام کی اولاد اپنے باپ کے نام سے مشہور ہوتی ہے ماں کے نام سے نہیں۔ سوسائٹی کے آداب لکھنؤ کی گالیاں ہیں۔ ممیشہ کوئی نیا سا راستہ نکل آتا ہے۔"

نواب صاحب مسکرائے۔ سر کھجایا اور اقبال کے تارے، چاند اور موجِ بیتاب کی طرح کوئی جواب نہ دیا۔

اور پھر مہمانوں کے آنے سے پہلے ہز ہائی نس لاؤنج میں آ گئے۔ ایک آدھ منٹ بعد ہز ہائی نس بھی آ گئیں۔ غضنفر اور شفیع مہمانوں کو موٹر سے لاؤنج تک لاتے رہے اور ان سے ڈرنکس کے متعلق پوچھتے رہے۔ دوسری ہی موٹر ذوالفقار حسینی کی تھی۔ ان کے سر کے زیادہ تر بال سفید ہو چکے تھے اور ان کے ساتھ ہلکے گلابی رنگ کا بڑا خوب صورت گون پہنے جل روبن شائن تھی۔

"ہلو، گز۔" جل نے غضنفر کی طرف ہاتھ بڑھایا جس پر ایک بڑی خوبصورت انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ اور پھر ذوالفقار حسینی کی طرف مخاطب ہو کے وہ کہنے لگی۔ "انکل میں نے اس سے پہلے گز سے آپ کا تعارف کرایا ہوگا۔ یاد ہوگا۔ میں جب کیمرج میں تھی یہ بھی اس زمانے میں کیمرج میں تھے۔"

"اچھا؟ بڑی خوشی ہوئی۔" سر ذوالفقار نے بے خیالی میں اپنا ہاتھ بلکہ دو تین انگلیاں غضنفر سے ملائیں اور ہز ہائی نس سے ملنے کے لئے بڑھے جو اس درمیان میں بے صبری سے برآمدے میں آ گئے تھے۔ لگے ہاتھوں ذرا

جل سے مذاق کرنے کے لئے۔

ایک دو منٹ کا وقفہ غضنفر کو مل گیا تھا۔ "جل! اتنے دنوں بعد تم سے مل کے بڑی خوشی ہوئی"

"سچ مچ؟" جل نے پوچھا۔

"تم سے ملنا تو قریب قریب ناممکن ہے" غضنفر نے آہستہ سے کہا۔

"جب انکل سکریٹریٹ میں ہوں تو تم مجھے ٹیلیفون تو کر ہی سکتے ہو۔ جب انکل گھر میں ہی رہتے ہیں تو میں مصروف رہتی ہوں" جل نے کہا۔

"ظاہر ہے" غضنفر نے ملے جلے طنز اور اخلاق سے کہا۔

"گز، ہم میں بالکل تبدیلی نہیں ہوئی۔ سچ مچ تم سے مل کے خوشی ہوئی ... . اور یور ہائی نس" اس اثنا میں سردوالفقار ہز ہائی نس کے قریب بیٹھ کے گملٹ کا گلاس ٹرے سے اٹھا رہے تھے اور ہز ہائی نس جل کے پاس آ چکے تھے

"اب آپ کیسی ہیں، مسز روبن شتائن۔ میرا خیال تھا آپ آج نہیں آئیں گی۔ دغا دے جائیں گی" ہز ہائی نس نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"اب ..... ہز ہائی نس میں آپ سے ایک راز کی بات کہوں۔ میں کبھی دغا نہیں دیتی، کبھی نہیں" جل ہنسی اور اپنا ہاتھ ہز ہائی نس کے ہاتھ سے چھڑایا۔ جواب تک ان کے پنجے میں ڈھیلا پڑا ہوا تھا۔ ایک اور موٹر پورٹیکو میں آ کے رکی تھی۔ غضنفر اس طرف بڑھا اور شفیع جل کو اندر لاؤنج میں لے گیا جہاں ہز ہائی نس نے ایک بڑی چوڑی "سویٹ" سی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا لیکن ہاتھ نہیں ملایا اور اسی طرح سردوالفقار حسینی سے باتیں کرتی رہیں۔

غضنفر جب واپس آیا تو اسے صاف نظر آ گیا کہ ہز ہائی نس کا یہ "اسنب" چاقو کی طرح جل کے کلیجہ میں اتر چکا تھا۔ پھر بھی وہ ہز ہائی نس اور مسز آر۔ کے نہرو

سے برابر اخلاق سے ہنس ہنس کے باتیں کئے جا رہی تھی۔

ہز ہائی نس کے دائیں ہاتھ پر مہارانی کوچ کلاں کو کرسی دینے کے بعد غضنفر میز کے سرے پر اپنی جگہ پر آ کے بیٹھ گیا۔ ہز ہائی نس اب مہارانی کوچ کلاں سے ہنس ہنس کے بڑے تپاک سے باتیں کر رہے تھے۔ یہی "چھ .....ال" تھی جس پر صبح کو قہقہے اُڑ رہے تھے۔

جل غضنفر کے سیدھے ہاتھ پر تھی۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اس میز پر ظاہر ہے اسے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ محض "برداشت کی جا رہی ہے"۔

"ذرا خیال تو کرو کسے معلوم تھا اتنے سال بعد یہاں دلّی میں ملاقات ہوگی" اس نے جل سے کہا۔

"دنیا بڑی مختصر ہے" جل نے اختصار سے کہا۔

ہز ہائی نس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ اپنے ہی کسی مذاقیہ جملے پر اخلاقاً اپنا کانٹا اپنی پلیٹ میں رکھ کے مہارانی کوچ کلاں، اپنا سفید ہوتا ہوا سر پیچھے جھکا کے ہنسنے لگیں۔ اخلاقاً ہر ہائی نس نے مصنوعی ہنسی میں اپنے دانتوں کی ذرا سی خوب صورت جھلک دکھائی اور سر ذوالفقار حسینی سے جو ان کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے تھے آسام کے مردم خوروں کے مزید حالات سننے لگیں۔

"جل"

"کیا گز؟"

"میں ایک سوال پوچھ سکتا ہوں" غضنفر نے آہستہ سے جل سے پوچھا۔

"پوچھو"

"تم خوش ہو؟" اس نے بچّوں کی طرح پوچھا۔

"خوشی۔ مائی ڈیر بوائے" جل ہنسی۔ دنیا دار کی بے تکلف سی ہنسی "خوشی

بڑی اضافی چیز ہے۔ ہاں میں خوش ہوں۔ بڑا مکان۔ باغ۔ بیوک .... ہر چیز۔ اس سے زیادہ عورت اور کیا چاہتی ہے۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔" غضنفر نے آہستہ سے کہا اور اس نے وہ فرانسیسی کہاوت دہرائی۔ "شاکاں سادی!"

آہستہ آہستہ جل نے وہی الفاظ دہرائے۔ "شاکاں سادی!" اور پھر خود ہی انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا۔ "ہر ایک کے لئے اس کی زندگی ...."

لیکن گز .... چیرآپ .... تم کس قدر ماربڈ ہوتے جا رہے ہو۔ کس چیز نے تمہیں بدل دیا ہے۔ .... یہاں کے موسم نے یا دربار نے؟"

"کچھ موسم نے، کچھ دربار نے، کچھ زندگی نے۔ بہر حال جل اتنا میں مانتا ہوں کہ اس قدر بلاد سے محسوس کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہ چیرآپ اولڈ بوائے۔ یاد ہے تمہیں کبھی کبھی میں کیمرج میں بھی میلنکلی ٹراک کہتی تھی۔"

لنچ کے بعد جب مہمان جا چکے اور ہز ہائی نس کا ارڈرلی ان کا سگار سلگا چکا اور وہ بھی اپنے کمرے کو رخصت ہو چکے تو نواب مطمئن جنگ اپنی لیڈی کمپینین جینی اور غضنفر کی موجودگی میں ہز ہائی نس نے لنچ پر تبصرہ شروع کیا۔

"سر ذوالفقار حسینی اچھے خاصے چارمنگ آدمی ہیں لیکن جینی ان سے پانچ منٹ سے زیادہ عرصے کے لئے کسی موضوع پر گفتگو کرنا ناممکن ہے۔ قطعاً قطعاً ناممکن اور میرے شوہر کیوں نواب صاحب۔ مہارانی کوچ کلاں سے وہ مذاق جو انھوں نے کیا تھا کتنا ٹیکٹ لس تھا۔ میں نے تو پیٹھ پر سردی کی جھرجھری سی محسوس کی لیکن سُننا سب کو چاہئے تھا .... ہاہا .... ہنسنا ضروری تھا .....

اور وہ عورت ..... جل رُوبن شتائن۔ کیوں غضنفر؟ میں نے تمہیں اس کنارے پر دیکھا کہ تم اچھی خاصی ترقی کر رہے تھے۔ نو بٹے دس تو تم جل ہی سے باتیں کرتے رہے؟ ..... غضنفر تم اسے برداشت کیونکر کر سکتے ہو ..... تمہارے ذوق پر مجھے حیرت ہوتی ہے ....."

"یور ہائی نس میں کیمرج کے زمانے سے اسے جانتا ہوں" غضنفر نے کہا۔

"اور جینی، تم اس طرح خاموش بیٹھی رہیں، جیسے ..... جیسے مہاتما گاندھی اپنی خاموشی کے روزے کے دن ... ہاہاہا ..... مگر تم کیا کرتیں۔ ایک طرف غضنفر جل سے فلرٹ کر رہے تھے ....."

"نہیں یور ہائی نس" غضنفر نے ہنس کر احتجاجاً کہا۔

دوسری طرف ہز ہائی نس نے اس کی پروا کئے بغیر کہا "نواب صاحب مہارانی کوچ کلاں کو ہز ہائی نس کے حملوں کے بعد ذرا ذرا سے اخلاق کا سہارا دے رہے تھے ..... میں نے تو یہ محسوس کیا نواب صاحب کہ آپ بہت ٹیکٹ فل ہیں۔ میرے شوہر تو بچاری مہارانی پر توہین کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ میں اب تک اس ہندوستانی مذاق کرنے کے طریقہ کی عادی نہیں ہوئی اس لئے میں اصرار کرتی ہوں کہ ہر دعوت میں کم سے کم ایک بڑے انگریز کا شامل ہونا ضروری ہے۔ میرے شوہر کے لئے بریک کی ضرورت ہے .. .. کیوں نواب صاحب آپ کو مجھ سے اتفاق نہیں ..... خیر اتنا تو آپ مانیں گے کہ بڑا ہی ناکام لنچ تھا"

نواب صاحب شاطرانہ سیاست سے بغیر کچھ کہے ہوئے ہنسے، اور ہز ہائی نس کو چوچا کلیٹ کھاتی ہوئی لمبے لمبے ڈگ بھرتی اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہی تھیں انھوں نے اور غضنفر نے جھک کر سلام کیا۔ ہز ہائی نس نے

"خدا حافظ، نواب صاحب" کہا اور پردے کے پیچھے غائب ہوگئیں۔

اور سال ہی بھر بعد جب غضنفر صبح کو ہز ہائی نس اور ہر ہائی نس کے پاس خبروں کا روزانہ خلاصہ بھیج رہا تھا، جو ہر صبح بھیجا جاتا تھا تو اس نے ایک خبر پر سرخ پنسل سے نشان لگایا۔ خبر یہ تھی کہ جل روبن شتائن سے سر ذوالفقار حسینی نے شادی کر لی ہے۔

دل ہی دل میں وہ اس خیال سے مسکرایا کہ اس سال جب انویسٹیچر کے لئے دہلی جانا ہوگا تو وائسرائے کے میز پر جل کو ہر ہائی نس کے مقابل بہت اونچی جگہ ملے گی کیونکہ جل کا نمبر فہرست مراتب میں پانچواں ہوگا۔ اور ہر ہائی نس کا اور تمام شہزادیوں اور راج کماریوں کی طرح گیارھواں۔ نواب مطمئن جنگ نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا .... اور اپنی ریاست کے وزیر اعظم کے ذریعہ سے کوشش بھی کی تھی کہ گیارہ سے آٹھ نمبر ہو جائے۔ خطاب کی وجہ سے۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

اور اس زمانہ میں جب کہ یہ لوگ لنچ کے میز پر بور ہوتے جاتے تھے اور دوسروں کو بور کرتے تھے۔ جب کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی کوئی ناکام لنچ یا ناکام ڈنر تھی۔ براعظم نے ایک خون میں ڈوبی ہوئی انگڑائی لی۔ لیکن ابھی ابتدا تھی۔ ابھی ایک کروڑ آدمی بے گھر نہیں ہونے پائے تھے۔ ساٹھ ستر ہزار عورتیں اغوا نہیں ہوئی تھیں۔

اپریل ۱۹۴۷ء کا دوسرا ہفتہ تھا جب غضنفر وہاں پہنچا۔ آنریبل سر ذوالفقار حسینی اب آنریبل نہیں رہے تھے اور صبح کے اخبار نے اطلاع دی تھی کہ وہ مقبولیت عام حاصل کرنے کے لئے ڈیرہ اسماعیل خاں گئے ہوئے ہیں۔

غضنفر نے جل کو ٹیلیفون کیا۔ ٹیلیفون پر قہقہوں کا روپہلا سیلاب آیا۔

"کون؟ گز؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ پور بوائے؟ کہاں ٹھہرے ہو؟ امپریل میں؟ ہاں ہاں۔ ضرور۔ ضرور آؤ۔ سنو۔ آج شام کو کچھ کام ہے۔ آج۔ آج شام کو؟ تو پھر ڈرنکس کے لئے آؤ۔ مکان تمہیں مل جائے گا۔ پرانی سکرٹریٹ سے ذرا آگے۔ بندہ علی منیشن۔ اچھا شام کو چھ بجے کے قریب چیریو۔"

غضنفر نے تانگہ لیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اتنی دور کی مخ مخ عذاب جان ہو جائے گی۔ جب وہ پہنچا تو شام کا سرمئی رنگ کالا پڑ چکا تھا۔ جل روبن شتائن مسکراہٹ ہونٹوں کے علاوہ گالوں کی ہر ہر شکن پر کھیلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ کے 'ہلو' کہہ کے صوفہ پر دوسری طرف بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹ جوانی کے رس سے چمک چمک کے اب کچھ افسردہ ہو چلے تھے۔ سفید دانت، اسی طرح زندہ دل زندگی سے بھری ہوئی مگر اب ذرا مصنوعی طور پر "گراں دام" کے آداب اختیار کئے ہوئے۔ لیکن سر ذوالفقار حسینی کی بیوی اب بھی اپنج اپنج جل روبن شتائن تھی۔ غضنفر نے اسے شادی کی مبارک باد دی اور ادھر اُدھر دیکھا تو ڈرائنگ روم یوں ہی سا تھا۔ کوئنس وے والے عالیشان مکان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ غضنفر سے پوچھ کے اس کے لئے اس نے وہسکی منگائی اور اپنے لئے۔ شیری۔ شیری کا گلاس سنبھالنے میں سلیکس کی شکنیں جا بجا اس کے سڈول جسم پر پڑیں۔

"گذشتہ مرتبہ تم سے دلّی میں ملاقات نہیں ہوئی۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں گذشتہ سال میں انوسٹیچر کے زمانے میں ساتھ نہیں آسکا۔"

وہ قہقہہ لگا کے ہنسنے لگی۔ "کاش تم وائسرائے کے ڈنر میں موجود ہوتے مجھ سے پانچ نشست پیچھے تمہاری والی ہر ہائی نس کی نشست تھی۔ مجھے

حیرت ہے کہ ایک لقمہ بھی اس کے حلق سے کیسے اُتر سکا۔" اور پھر اس نے ڈنر کی تفصیلات بیان کرنی شروع کیں۔

اور وہسکی اور سوڈا۔

اور باتیں بڑھتی ہی گئیں۔ اب گفتگو کا موضوع نواب امتیاز خاں تھے۔

"غضنفر کیا کیمرج میں تمہارا اور امتیاز کا ساتھ نہیں رہا؟ نہیں تو پھر ان کی تم سے دوستی کس طرح ہوئی؟" غضنفر نے لاکھ کہا کہ امتیاز نے کیمرج میں نہیں آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ مگر وہ اصرار کرتی رہی کہ نہیں اس زمانے میں امتیاز برابر کیمرج ہی میں تھے۔

ایک اور وہسکی اور سوڈا۔ ایک اور شیری۔ غضنفر نے اپنے آپ کو دفعتاً گوئی اور اجنبی محسوس کرنا شروع کیا۔ گویا اس وقت وہسکی اور سوڈا اور شیری سے جو حال پیدا ہوا ہے وہی حال ہے اور ماضی اور مستقبل کا وجود نہیں۔

غضنفر سے باتیں کرتے کرتے وہ ٹیلیفون منگواتی ہے۔ "یعقوب ہیں ... . جیک ..... سنو ..... جیک تم میرا ایک کام کر دو گے ..... بلی ..... اسٹوپڈ" پھر قہقہوں کا سیلاب ابلتا ہے ....." سنو تو میں کیا کہہ رہی ہوں ..... میری بہن کے لئے ایک پارسل انگلستان لے جاؤ گے ....." وہ ٹیلیفون میں ہنستی ہے اور ریسیور کو نیچے رکھ دیتی ہے۔

وہ پھر امتیاز کا ذکر چھیڑتی ہے۔ اب داستان واضح ہوتی جاتی ہے غضنفر اس کا پرانا ملاقاتی اس کی ہمت افزائی کرتا جاتا ہے۔ وہ اور رازدارانہ طرزِ گفتگو اختیار کر لیتی ہے۔ نئے لیڈر اور پرانے لیڈر کی رقابت آج نئے لیڈر سے گورنر کی ملاقات ہوئی ہوگی۔ نئی وزارت کی تشکیل کے لئے۔ اور اس کا شوہر جو پرانا لیڈر ہے صوبہ کا وزیر اعظم بننے سے محروم رہ جائے۔

یہ کون سا انصاف ہے۔

(اور غضنفر اپنے وہسکی کے گلاس سے سرگوشی کرتا ہے اس طرح کہ جل نہ سُننے پائے جو اسے بڑی سرگرمی سے قائل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جل اولڈ گرل۔ تم نے بوڑھے آنریبل ممبر سے شادی اسی تقریب میں تو کی تھی۔ تاکہ اپنے صوبے کے وزیر اعظم کی بیوی بنو۔)

"عوام نہ امتیاز کو پسند کرتے ہیں اور نہ نئے لیڈر کو، وہ میرے شوہر کو پسند کرتے ہیں۔" سلیکس سڈول جسم پہ لہرائے اور عنابی ہونٹوں نے شیری سپ کی۔

"دوسرے لیڈر بھی عام طور پہ ان دونوں کو پسند نہیں کرتے۔ میرے شوہر کو پسند کرتے ہیں۔" غضنفر دل ہی دل میں مسکرایا اور سُنتا رہا۔ "لیکن نیا لیڈر امتیاز کو پسند کرتا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ نئے لیڈر کی قابلیت کچھ یوں ہی سی .... دِل۔ دِل ..... بوائے صاحب کے لئے اور وہسکی اور سوڈا۔ امتیاز ہی وہ طاقت ہے جو نئے لیڈر کے پیچھے کام کر رہی ہے۔"

بالآخر غضنفر نے کہا۔ "جل خدا کے لئے ..... تمہارے صوبے کے معاملات سے میں اچھی طرح واقف نہیں ....."

غضنفر سے اور قریب ہو کے جل نے کہا۔ "گز اولڈ بوائے تم فرخندہ نگر واپس کب جاؤ گے۔"

"ابھی کچھ ٹھیک نہیں۔"

"ابھی کچھ دن تو یہاں رہو گے نا۔"

"ہاں کچھ دن۔"

"امتیاز سے ملو گے نا۔"

"غالباً۔"

ہوئے بولا ——— "سچ مچ آ گئی لاجونتی بھابی؟"

لال چند نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ——— "واگہ پر سولہ عورتیں پاکستان نے دے دیں اور اس کے عوض سولہ عورتیں لے لیں ——— لیکن ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ہمارے والنٹیر اعتراض کر رہے تھے کہ تم نے جو عورتیں دی ہیں ان میں ادھیڑ، بوڑھی اور بے کار عورتیں زیادہ ہیں .... اس تنازعہ پر لوگ جمع ہو گئے۔ اس وقت اُدھر کے والنٹیروں نے لاجو بھابی کو دکھاتے ہوئے کہا "تم اسے بوڑھی کہتے ہو .... دیکھو دیکھو جتنی بھی لڑکیاں تم نے دی ہیں ان میں سے ایک بھی برابری کرتی ہے اس کی؟" اور وہاں لاجو بھابی سب کی نظروں کے سامنے اپنے تیندوے چھپا رہی تھی ....

پھر جھگڑا بڑھ گیا۔ دونوں نے اپنا اپنا "مال" واپس لینے کی ٹھان لی۔ میں نے شور مچایا ——— "لاجو ——— لاجو بھابی ———" مگر شور مچانے پر ہماری فوج کے سپاہیوں نے ہمیں ہی مار مار کے بھگا دیا۔

اور لال چند اپنی کہنی دکھانے لگا۔ جہاں اسے لاٹھی پڑی تھی۔ رسالو اور نیکی رام چپ چاپ بیٹھے رہے اور سندر لال کہیں دور دیکھنے لگا۔ شاید سوچنے لگا۔ لاجو آئی بھی پر نہ آئی .... اور سندر لال کی شکل ہی سے جان پڑتا تھا جیسے وہ بیکانیر کا صحرا چھان کر آیا ہے اور اب کہیں درخت کی چھاؤں میں زبان باہر نکالے ہانپ رہا ہے منہ سے اتنا بھی نہیں نکلتا ——— "پانی دے دو" اسے یوں محسوس ہوا، بٹوارے سے پہلے اور بٹوارے کے بعد کا تشدد ابھی تک کارفرما ہے۔ صرف اس کی شکل بدل گئی ہے۔ اب لوگوں میں پہلا سا دریغ بھی نہیں رہا۔ کسی سے پوچھو سانبھر والا میں لہنا سنگھ رہا کرتا تھا اور اس کی بھابی بنتو ——— تو وہ جھٹ سے کہتا "مر گئے" اور اس کے بعد موت اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر بالکل عاری

"دیکھو گز۔ محض اس لئے کہ تم اس صوبے کی سیاست سے واسطہ نہیں ممکن ہے تمہاری بات کا اثر ہو۔ گز اولڈ بوائے۔ اس سے مل کے اسے سمجھاؤ کہ میرے شوہر اس کے مخالف نہیں، دشمن نہیں۔ وہ نئے لیڈر کا ساتھ چھوڑ دے تو نئے لیڈر کی ساری حیثیت تاش کے پتوں کی طرح بیٹھ جائے گی۔ امتیاز ابھی جوان ہے تمہاری ہی اتنی عمر ہوگی اور میرا شوہر..... دل وہ اتنا زیادہ جوان نہیں۔ امتیاز کو میرے شوہر کے بعد صوبے کا وزیر اعظم بننے کا موقع مل ہی جائے گا۔"

جل کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ وہ شیری کا گلاس ختم کرتی ہے۔ یقیناً اس سلسلے میں فرخندہ نگر کے بچارے گز کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ امتیاز سے اس کی بڑی پرانی دوستی ہے۔ وہ ٹیلیفون کا ریسیور اٹھاتی ہے۔ نمبر ملاتی ہے۔ "یعقوب۔ یعقوب..... جیک..... جیک کا ٹیلیفون پر پتہ نہیں۔ وہ "بلاسٹ ہم" کہہ کے ریسیور پھر رکھ دیتی ہے۔"

وہ اٹھ کر کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتی ہے اور ملازم سے جس کے سر پر بڑا سا صافہ ہے، کہتی ہے کہ کمرے کے باہر کا دروازہ بند کر دو۔ نوکر شک کی نظروں سے غضنفر کی طرف دیکھتا ہے۔

دروازہ بند کر کے نوکر کھڑکی سے اندر جھانکتا ہوا چلا جاتا ہے۔ جل پھر اپنے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ "غضنفر آج شام تم کیا کر رہے تھے۔ میرا مطلب ہے کہیں جانے والے تھے؟ کہیں نہیں؟..... تو پھر کھانا یہیں کیوں نہ کھا لو۔ اپنی گاڑی کو واپس بھیجدو..... کیا کہا تم تانگے میں آئے ہو؟ میں کہتی ہوں گز تم بالکل پرولتاری ہوتے جا رہے ہو..... ہاہا ہا..... تانگہ واپس بھیجدو۔ سنو میں سکنڈ شو میں سنیما جا رہی ہوں۔ تمہیں امپریل میں چھوڑ دونگی۔

نہیں سینما ساتھ نہیں۔ سینما ایک دوست کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

غضنفر کو حیرت ضرور ہوئی۔ یہ کیمبرج والی جل، عجیب، بڑی ہی عجیب عورت تھی۔ یہ کھانے کی دعوت تو بالکل ایسی چیز معلوم ہوتی تھی جیسے آلڈس ہکسلے کے کسی ناول میں کسی خاتون کی غیر متوقع ہمت افزائی۔ اس نے دعوت شکریہ کے ساتھ قبول کر لی۔

"گز ڈیر"، جل نے معافی چاہی۔" میں ذرا جا کے نہا آؤں۔ ذرا کپڑے بدل لوں۔"

"ضـــرور"

پہلے وہ بائیں کمرے کی طرف جاتی ہے۔ اس کے شوفر نے مارواڑی پگڑی پہنی ہے۔ اس کو دیکھ کر وہ ہسٹریائی ہنسی ہنستی ہے اور ہنستی ہوئی آ کے یہ خبر غضنفر کو سنا جاتی ہے جو آہستہ آہستہ وہسکی کے تازہ بھرے ہوئے گلاس کا ایک کش لیتا ہے بالکل سگریٹ کی طرح۔ پھر وہ دائیں کمرے میں جاتی ہے جو غالباً اس کا ڈریسنگ روم ہے جس کے آگے ٹائلز کا غسل خانہ ہے۔ غضنفر دل ہی دل میں دعا کرتا ہے کہ یہ سیکنڈ شو میں لے جانے والا متوقع مہمان، یہ یعقوب، یہ جیک ...... جیک غلام۔ چڑیا کا غلام .... ہمارے گنجفے میں بازیٔ غلام نہیں ...... یہ جیک آج نہ آئے .... دائیں کمرے کے پار سے ٹب کے پانی سے جل کے کھیلنے کی خوشگوار آواز آ رہی ہے۔ وہ ادھر ادھر دیکھ کر کوئی ملازم تو قریب نہیں آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھوں کی بیچ کی انگلیاں قریب لا کے فال دیکھتا ہے۔ نہیں یہ جیک نہیں آئے گا۔ پھر بھی سوڈا اور وہسکی کے نئے گلاس کے ساتھ غضنفر نے آنے والے مہمان کا تصور قایم کیا۔ ایک نوجوان تیس سال سے کچھ اوپر۔ ذرا تیز قسم کا عین

اس وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ ٹنک کرنے والا نوکر جس لہجے میں بات چیت کرتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے یہ جیک ہی ہے "صاحب بڑی دیر سے یہاں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔" وہ ڈریسنگ روم تک جا کے یہ پیغام اپنی مالکہ کو سناتا ہے۔ پھر ٹیلیفون باتھ روم پہنچا دیا جاتا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے امریکی فلموں میں ہوا کرتا ہے۔ غضنفر ٹیلیفون کے لانبے سے تار کو دیکھ رہا ہے۔ ہیڈی لاماریا ڈٹا ہے، درتھ یا کوئی اور "اومف گرل" اپنے باتھ ٹب سے اپنے کسی چاہنے والے کو ٹیلیفون کر رہی ہے۔ باتھ ٹب کی طرف سے دلربایانہ محبوبانہ قہقہے کی آواز آتی ہے جیسے سیماب، جیسے پگھلی ہوئی چاندنی "کھانے پر آج مت آؤ" "نہیں تم نہیں آسکتے۔ قہقہہ بجھ جاتا ہے۔ اس کی جگہ عورت کے تلون کی ہسٹریائی چیخ ہے "کیونکہ ...... کیونکہ ایک مہمان اور ہے" "کیا؟" "میں سمجھی تم نہیں آؤ گے، میں نے اور کسی کو مدعو کر لیا ہے" "ہیوئز میں کیا کروں۔ تم مجھے پاگل کئے دے رہے ہو .... میں کہہ رہی ہوں کھانے پر کوئی اور مدعو ہے جس سے مجھے ضروری باتیں کرنا ہیں کھانے کے بعد" .... "میں کیا کروں" لیکن بالآخر تلون اور ہسٹریا نے ہتھیار ڈال دیئے۔ "اچھا تو پھر سیدھے کشمیر گیٹ کی طرف، پھر اولڈ سکرٹریٹ، پھر سیدھے طرف مڑ، پھر بائیں طرف" اور آخر میں دلربایانہ قہقہہ گونجا "ایڈیٹ" چھیڑنے والا معشوقانہ قہقہہ "اسٹوپڈ" اور قہقہے۔ زندگی سے بھرے ہوئے۔ ہر قہقہے سے زندگی کی صحت نمایاں۔ پھر فلم اسٹار، ہیڈی، مار کے باتھ ٹب میں غوطہ لگانے کی مبہم سی سرسراہٹ .....

..... اور بالآخر غضنفر کے پسینے کی طرح ملازم ٹیلیفون کا ریسیور اٹھائے ہوئے واپس آتا ہے۔

رقیب آہی جائے گا۔ غضنفر دل ہی دل میں فیض کی رقیب والی نظم کا

ایک آدھ شعر گنگناتا ہے۔ چند ہی منٹ میں ایک موٹر آتی ہے اس نوکر کے ساتھ ایک شخص اندر آتا ہے۔ عمر چالیس سے زیادہ پچاس کے قریب اور ایسی زبردست صیہونی ناک جو اٹھان میں جمی ڈیورنٹ کی ناک سے کچھ ہی کم ہوگی قطعاً شتونیل وہ اپنے ساتھ وہسکی کی ایک بوتل لایا ہے اور نوکر سے کہتا ہے "ایک بڑا انڈیل دو" غضنفر انکار کرتا ہے۔ شکریہ ادا کرتا ہے۔ خاموشی بے معنی خاموشی ناگوار خاموشی۔ غضنفر آنے والے کا جائزہ لیتا ہے۔ اتنے میں نہائی دھلی مہکتی ہوئی جل آجاتی ہے۔

"ہلو جیک"

"ہلو جل"

غضنفر بچپن کا آموختہ دل ہی دل میں دہراتا ہے۔ "جیک اینڈ جل وینٹ اَپ دی ہل"

"جل میں ..... میں ..... جمی ڈیورنٹ کی بڑی سی ناک احتجاجاً بڑا وہسکی میں غرق ہو جاتی ہے۔

"مجھے تعارف تو کرانے دو" جل ہلکا روپہلا، کھوٹے روپے کا سا قہقہہ لگاتی ہے۔ عورت ہر ناگوار موقف پر قابو پا لیتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس کا تعلق اس کے اپنے ڈرائنگ روم یا کھانے کی میز سے ہو۔

"یہ مسٹر غضنفر علی خاں ہیں۔ فرخندہ نگر کی سول سروس میں کچھ ہیں وہاں عہدوں کے عجیب و غریب نام ہوتے ہیں کیول گزاور یہ جیک ....."

پھر وہ یعقوب یا جیک کا تفصیلی تعارف کراتی ہے لیکن یعقوب کا اس صدمہ سے جانبر ہونا مشکل ہے کہ راستہ بھٹک کر اس نے موٹر کو غلط سڑک پر موڑ لیا تھا۔ "میں بندہ علی روڈ کی طرف بھٹک گیا تھا تم نے کہا تھا بندہ علی نیشن۔

میں سمجھا بندہ علی روڈ۔ میں بندہ علی روڈ کی طرف نکل گیا تھا۔"

اس صدمے کو بھلانے کے لئے وہ بڑا دہکی کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق کے نیچے بڑی تہذیب اور متانت سے اتارتا ہے۔

یعقوب کو اُردو بالکل نہیں آتی۔ صرف انگریزی اور انگریزی بھی نہیں صرف آکسونین۔

"اب بھی جل غضنفر کو سکھا پڑھا کے امتیاز کے پاس بھیجنا چاہتی ہے۔ اور لگے ہاتھوں یعقوب کے رشک کو بھڑکانا بھی چاہتی ہے۔ وہ اخلاق کو عشوے سے ضرب دے کے حاصل ضرب کو مصلحت پر تقسیم کرتی ہے۔" جیک تمہاری آج کہیں اور دعوت ہے نا؟ تم کہیں اور جا رہے ہو نا؟" یعقوب کہتا ہے میں پیڈرنگ ختم کر کے چلا جاؤں گا۔ بہت بہت شکریہ آکسونین۔ جل جیک کو اور زیادہ ستاتی ہے۔ معلوم نہیں یعقوب کو غضنفر سے جلانے یا غضنفر سے کچھ دیر "بزنس" کی گفتگو کے لئے۔ غضنفر کو بہر حال لطف آ رہا ہے۔ دفعتاً وہ یعقوب سے کہتی ہے۔" مگر جیک تمہاری کوئی اور ڈیٹ ہے نا آج؟"

"اس سے کیا تعلق؟" اور جیک 'بڑا' باقیات الصالحات کو گلاس میں ہلاتا ہے۔

"تمہاری آج یکاڈلی میں ڈیٹ ہے نا؟"

وہ دفعتاً لگام کھینچ لیتا ہے۔" میں تو آج یہیں کھانا کھا کے جاؤں گا۔"

رفتہ رفتہ حسین میزبان کو اس کھیل میں شکست ہو رہی ہے۔ غضنفر کو لطف آ رہا ہے۔ ملازمین جو صورتِ حال کے مستقبل سے واقف ہیں پہلے ہی سے تین کے لئے میز لگا چکے ہیں۔

بالآخر وہ ایک قہقہے کے ساتھ ہار مان کے کہتی ہے۔" تو پھر تم ٹھہر ہی جاؤ۔"

جیک کہتا ہے۔ "نہیں میں چلا جاؤں گا"۔ جل کہتی ہے۔ "نہیں ٹھہرو"۔ جاؤ۔ ٹھہرو۔ جاؤ ٹھہرو۔ خالص ترین آکسونین۔ جیک کی بلند و برتر ناک اور اس کا چھوٹا سا دہانہ بہت ناراض ہیں۔ سخت شکایت کے عالم میں۔ بہت بہت ناراض اور آخر اخلاق اور عشوے اور مصلحت کی یہ چوسر بازی ختم ہوتی ہے اور جیک کہتا ہے۔ "تم نے مجھے مدعو کیا ہے کہ نہیں؟ میں غلط سڑک .... اس بندہ علی روڈ پر صدیوں تک .... آدھے گھنٹے تک بھٹکتا پھرا اور اب تم کہتی ہو ہٹ آؤ۔ جاؤ۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ بہت غیر معمولی ہے، غیر معمولی"۔ یہ آکسونین کے ساتھ لمبی اونچی ناک چمک چمک اٹھتی ہے۔

اس درمیان میں غضنفر پس منظر میں غائب ہو گیا ہے۔ بڑی ناکام صورتِ حال۔ ڈرائنگ روم کی ملکہ جل اسے پھر سے گفتگو میں گھسیٹ لیتی ہے۔ "غضنفر امتیاز کے بڑے دوست ہیں۔ یہ دونوں ہمارے زمانہ میں کیمرج میں تھے"۔

"میں شرط لگا سکتا ہوں کہ امتیاز کبھی کیمرج میں نہیں رہے۔ وہ آکسفورڈ میں ...."

"ہاں وہ آکسفورڈ ہی گئے تھے"۔ غضنفر نے توثیق کی۔

"کس کالج میں تھے؟ آپ کو یاد ہے؟"

"میڈلین"۔ غضنفر نے جواب دیا۔

"آکسونین کے کان کھڑے ہوئے"۔ آپ کا مطلب ہے، ماڈلین یقیناً ان آٹھ دس برسوں میں تلفظ بدل تو نہیں گیا"۔ اب آکسونین کو انتقام کا موقع مل گیا۔ جم ڈیورنٹ کی ناک شکاری پرندے کی طرح اپنے شکار پر جھپٹی۔ "یقیناً ماڈلن کے قریب کوئی اور کالج تو نہیں بنایا گیا جس کا نام میڈ لے اے این ہے"۔ جل بھی اس پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ اس شام کی حد تک جیک نے

غضنفر پر فتح پالی تھی۔ اس کی شام بہر حال تباہ کر دی۔ صرف ایک لفظ کے غیر شائستہ تلفظ کی پکڑ سے۔ اب جل نے بھی تصفیہ کر لیا۔ کھانے کا مہمان خاص جیک ہے گز نہیں۔ اب وہی خاص مہمان ہے جو شوہر کے غائبانے میں آیا کرتا ہے! ولیت اسی کو حاصل ہے، اس دوست کو نہیں جو شوہر کی طرف سے جا کے پیروی کرے چنانچہ کھانے کے میز پر وہ جیک کو اپنے سیدھے ہاتھ پر بٹھانا چاہتی ہے اور غضنفر کو اپنے مقابل۔ لیکن جیک پکے آکسونین کی طرح شکست خوردہ غنیم سے اخلاق برتتا ہے اور غضنفر کو جل کے سیدھے ہاتھ پر بٹھاتا ہے۔

غضنفر اپنی حسین میزبان جل کو دیکھ رہا ہے۔ اس نوجوان تر و تازہ سیدھی سادھی آسٹرین لڑکی سے کتنی مختلف ہے جسے وہ دس بارہ سال پہلے کیمرج میں جانتا تھا۔ حسین میزبان اس کی بائیں جانب بیٹھی ہے۔ بھرے ہوئے بازو اور عریاں شانے اور پختہ اور ان سب میں ملی جلی کسی سینٹ کی انوکھی خوشبو۔

جیک ابھی تک سڑک کے غلط موڑ کے صدمہ سے جانبر نہ ہوا اور اگر بندہ علی روڈ پھر بھٹکنے کا ذکر نہیں تو پھر میڈے والے اے۔ لے۔ این کالج۔

"بائی دی دے آپ فرانسیسی جانتے ہیں؟"

"آے بیاں"۔ یہاں جیک گز کو شکست نہیں دے سکتا۔

تلخی کو اپنی کھانے کے میز سے مٹا دینے کے لئے جل اپنے پہلے فرانسیسی میک اپ کا قصہ مزے لے لے کے سناتی ہے۔ اس میک اپ میں اسے دیکھ کر اس کے انگریز دوستوں کو ایسا صدمہ ......

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ "معاف کرنا" وہ کھانے کے کمرے کے باہر دوڑ جاتی ہے۔ "ہلو" اور پھر وہی کھنکھناتی ہوئی ہسٹریائی معشوقانہ ہنسی۔

جیک سڑک کے غلط موڑ کو نہیں بھول سکتا۔ اس نے کہا۔ "بندہ علی مینشن۔ میں سمجھا بندہ علی روڈ۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس بدبخت شہر میں بندہ علی مینشن اور جگہ ہے اور بندہ علی روڈ اور جگہ۔ پلیز ز۔"

اور زیادہ بورنگ آکسونین۔ جب غضنفر اس کے متعلق پوچھتا ہے تو وہ کہتا ہے "فرگٹ اِٹ"۔ "میں ان بڑے آدمیوں میں سے نہیں۔ میں کوئی نہیں۔ میرے وزیر ہونے کا کوئی امکان نہیں۔"

وقفہ .... مزید آکسونین۔ جل ٹیلیفون پر قہقہے لگا رہی ہے۔ برنجی روپہلے، سنہرے قہقہے۔ وہ بے صبری سے سُوپ پینے لگتا ہے۔ "اس کا انتظار مت کیجیے۔ یہ سب غیر معمولی ہے۔ بہت غیر معمولی۔"

غضنفر پھر (اپنی) میزبان کا منتظر ہے۔ سُوپ پلیٹ کے حاشیے پر اس کا مونا گرام بنا ہے۔ اسے وہ پڑھتا ہے۔ "جے۔ آر۔" باآواز بلند۔

"جولیانا روبن شتائن۔" غضنفر سے جیک جلدی سے کہتا ہے۔ "اس کی خوشامد میں میں نے ایک آدھ بار کہا تھا۔ جولیانا رجے جی نا ملکہ جولیانا لیکن ان باتوں سے دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ پلیز اپنا سوپ ختم کیجیے ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ یہ ممکن ہے آدھے گھنٹے تک ٹیلیفون کرتی رہے۔"

آہستہ آہستہ غضنفر نے بھی سوپ پینا شروع کیا۔

"میں جل جولیانا سے بہت عرصہ سے واقف ہوں۔" جیک نے سُوپ پیتے پیتے کرکرے توس کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھ کر کہا۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ یہ دہری زندگی بسر کرتی ہے۔"

وہ پھر سُوپ پلیٹ پر جھک گیا اور اپنے الفاظ بڑی رازداری سے زور دے کے دہرائے۔ "دہری زندگی بسر کر رہی ہے۔"

ٹیلیفون پر اور زیادہ ہسٹریائی ہنسی۔ اس کی آواز میں عشوہ اور تنبیہ ملے جلے ہیں۔ شوخی سے ڈانٹ کے کہتی ہے" اِدھر دیکھو۔ میں تم سے ایک بات کہوں۔ میرے شوہر پرسوں واپس آجائیں گے پرسوں"۔ اور پھر اور زیادہ عشوہ ریز قہقہے اور آخر میں اختتامی لفظ" ایڈیٹ"۔

پھر جل واپس آجاتی ہے۔"معاف کرنا آپ لوگوں کو میرا انتظار کرنا پڑا"۔ اس کے چہرے پر قہقہوں کی سُرخی دوڑ رہی ہے " معلوم ہے کون تھا؟"

"مجھے پرواہ نہیں" جیک نے جواب دیا۔

" ایڈیٹ" جل مسکرائی۔ چکن اپنی پلیٹ میں لیتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ رائٹر والا آنند تھا مجھ سے گورنر اور نئے لیڈر کی گفتگو کی کہانی کہہ رہا تھا۔۔ ۔۔۔۔۔ ہاہاہا۔ گورنر کے ساتھ اتنی لمبی چوڑی اور اتنی اکیلی اکیلی ملاقات آج تک کسی نے نہیں کی۔ ہنستے ہنستے میرے پھیپھڑوں میں درد ہو رہا ہے"۔ اس نے ہسٹریائی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا" اتنی لمبی چوڑی اور ایسی اکیلی ملاقات۔ اور نئے لیڈر صوبے کے نئے وزیر اعظم نہیں بن سکیں گے۔ نہیں بن سکیں گے"۔

ہسٹریا اور خوش طبعی کے عالم میں اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

"ٹیک اِٹ ایزی" جیک نے جل سے کہا۔ غضنفر کو آکسونین لہجے میں امریکن سیلنگ سُن کر ذرا تعجب ہوا۔

اور کھانا ہوتا رہا۔ چکن اور ڈزرٹ۔

کھانے کے بعد شوفر کو گھر بھیج دیا گیا۔ گز! میں اور جیک سینما جا رہے ہیں تمہیں امپیریل پہ اتار دیں گے۔ تم سے امتیاز کے متعلق تو گفتگو ہو ہی چکی۔ کل تفصیل سے باتیں کریں گے۔ میں لنچ کے وقت امپیریل میں جاؤں گی۔

جیک نے جل سے کہا" تمہارے شوہر کی قسمت پر مجھے رشک آتا ہے

ان کی عمر اب کیا ہوگی؟"

"بادن" جل ہنستی ہے۔

"مجھے رشک آتا ہے۔ بڑا ہی خوش قسمت آدمی ہے۔"

جل صوفہ پر نیم دراز ہے۔ جیک آ کے اس کے قدموں کے قریب بیٹھ جاتا ہے۔ غضنفر کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ کہیں وہ مخل تو نہیں ہو رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں لکر آتی ہے۔

"جل تمہیں ہم خانہ کی وہ شام یاد ہے؟" جیک کہتا ہے۔

"ہاں" جل جواب میں ہنستی ہے۔

"اس روز مجھے سچ مچ تم سے عشق تھا۔"

"ایڈیٹ"

"بس صرف بیس منٹ تک"

"جیک تم ایڈیٹ ہو" جل آہستہ آہستہ لکر سپ کرتی ہے۔

"یہ بیس منٹ مجھے بار بار یاد آتے ہیں"

"اسٹوپڈ" جل کے چہرے پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ ہے۔

غضنفر محسوس کر رہا ہے کہ وہ اس راز و نیاز میں خواہ مخواہ مخل ہو رہا ہے۔ جل لکر ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ "بچارے گزکو نیند آ رہی ہوگی۔ چلو تمہیں امپریل پہنچا دیں۔"

جیک ڈرائیو کر رہا ہے۔ جل اس کے بازو بیٹھتی ہے۔ گز پیچھے بیٹھا ہے جل جیک سے مہاراجہ کپورتھلہ کے ڈرائنگ روم کا ذکر کر رہی ہے۔ یہاں سے وہاں تک عورتوں کی قدِ آدم برہنہ تصویریں تھیں۔ پانچ منٹ مہاراجہ نے بھی مجھے ان ننگی تصویروں کے درمیان تنہا چھوڑا۔ پھر پوچھا کہ ڈرائنگ روم پسند آیا۔

آگے چلا جاتا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر بڑے ٹھنڈے دل سے تاجر انسانی مال۔ انسانی گوشت۔ اور پوست کی تجارت اور اس کا تبادلہ کرنے لگے۔ جیسے منڈیوں میں مویشی خریدنے والے کسی بھینس یا گائے کا جبڑا ہٹا کر دانتوں سے اس کی عمر کا اندازہ کرتے ہیں اسی طرح وہ جوان عورت کے روپ، اس کے نکھار، اس کے عزیز ترین رازوں اسکے بھیدوں کی شارع عام میں نمائش کرنے لگے اور یہ تشدد اب تاجروں کی نس نس میں بس چکا تھا۔ پہلے منڈی میں مال بکتا تھا اور اب بھاؤ تاؤ کرنے والے ہاتھ ملا کر اس پر ایک رومال ڈال لیتے اور یوں "گپتی" کر لیتے گویا رومال کے نیچے انگلیوں کے اشاروں سے سودا ہو جاتا تھا۔ اب گپتی کا رومال بھی ہٹ چکا تھا اور سامنے سودے ہو رہے تھے اور لوگ تجارت کے آداب بھی بھول گئے تھے۔ یہ سارا لین دین، یہ سارا کاروبار پکاسیتو کی ایک داستان معلوم ہوتا تھا۔ ایک ایسا بیان جس میں عورتوں کی آزادانہ خرید و فروخت کا قصہ بیان کیا جاتا ہے اور ازبیک ان گنت عریاں عورتوں کے سامنے کھڑا ان کے جسموں کو ٹوہ ٹوہ کے دیکھ رہا ہے اور جب وہ کسی عورت کے جسم کو انگلی لگاتا ہے تو اس پر ایک گلابی سا گڑھا پڑ جاتا ہے اور اس کے اردگرد ایک زرد سا حلقہ اور پھر زردیاں اور سرخیاں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے لئے دوڑتی ہیں .... ازبیک آگے گزر جاتا ہے اور ناقابل قبول عورت ایک اعترافِ شکست، ایک انفعالیت کے عالم میں ایک ہاتھ سے ازار بند تھامے اور دوسرے سے اپنے چہرے کو عوام کی نظروں سے چھپائے سسکیاں لیتی ہے، اور آگے چل کر عورت کو انفعالیت کا احساس بھی نہیں رہتا۔ وہ اسی طرح عریاں اسکندریہ کے بازاروں میں گزرتی ہے اور تریفرا کی صورت اختیار کر کے اپنی سہیلی سیسو سے کہتی ہے —— "دیکھو سیسو! یہ کون ظالم مسخرا ہے جس نے سامنے کی دیوار پر لکھ دیا ہے۔

میں نے کہا "ڈرائنگ روم تو بہت اچھا ہے۔ لیکن آرٹ کی پسند کی حد تک میرا ذوق اتنا تہذیب یافتہ نہیں۔"

امپیریل آگیا تھا، کالنگ گرو جس کل لنچ پہ۔"

اور جیک نے کہا۔ "ماڈلین کے متعلق وہ ذکر معاف کر دینا، گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ" کہہ کے امپیریل کے باہر کے گیٹ کے سامنے غضنفر اُترا۔ سامنے ایک تانگہ والے کی لاش کو پولیس کی لاری میں رکھا جا رہا تھا۔ معلوم نہیں کس نے اس کے چھرا بھونک دیا تھا۔ آئندہ ہونے والے فسادوں کے لئے انسان کی پسلیوں پر چھریاں کبھی کبھی تیز کی جاتی تھیں۔

غضنفر کو ابکائی سی آئی۔ ذرا لڑکھڑایا۔ "کاک رابن کو کس نے مارا؟" اس نے پوچھا۔ والٹ ڈزنی کی نقل میں چڑیوں کا ایک کارٹون تھا۔ جو اس نے کئی سال پہلے دیکھا تھا۔ "کاک رابن کو کس نے مارا؟" اس نے سرور کے عالم میں گنگنانا شروع کیا۔

بے اختیار دو نام اس کی زبان پر آگئے۔ مگر ملزموں کی فہرست مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ہوٹل کے کاؤنٹر سے اس نے اپنے کمرے کی کنجی لی اور لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اور بھی کوئی ملزم تھا۔ اس نے سرور کے عالم میں سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے الزام کی انگلی اپنی طرف اُٹھائی۔

بڑی مشکل سے اس نے ہچکی ضبط کی اور جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

(سویرا ادب۔ کراچی)

اے حمید

قصہ پہلے درویش کا

پہلے درویش نے دوسرے درویش کی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور اپنے قصے کی ابتدا غالباً غالب کے اس شعر سے کی کہ ؎

اچھے عیسےٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

تینوں درویش اس شعر پر عش عش کرتے ہوئے اُٹھے اور پہلے درویش کا سر دھننے لگے۔ پہلے درویش کی پگڑی کھل گئی۔ اس نے پگڑی باندھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا۔

"بھائیو! اس غلام کمترین کی داستان بڑی المناک ہے۔ اس قدر المناک کہ رسالہ عبداللطیف کے ایڈیٹر نے اسے محض اس لیے چھاپنے سے انکار کر دیا تھا کہ اسے پڑھ کر کاتب کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ میری داستانِ غریب حمزہ ایک ایسے شہر کے ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوتی ہے۔ جو ہم سے تھوڑی دُور

ہمارے اردگرد پھیلا ہوا ہے۔ میں پہلی مرتبہ اس شہر میں وارد ہوا تو شریف آدمیوں کے لباس میں ملبوس تھا۔ چنانچہ اسٹیشن پر ہی پکڑ لیا گیا اور جیل خانے میں ڈال دیا گیا۔ دوسری مرتبہ میں گرہ کٹ کے بھیس میں نمودار ہوا تو ریلوے اسٹیشن پر میری خوب آؤ بھگت اور جاؤ بھگت ہوئی۔ لوگوں نے فرط عقیدت سے میرے گلے میں اتنے ہار ڈالے کہ میرا چہرہ ان میں چھپ گیا۔ اور جب میرا چہرہ چھپ گیا تو ایک آدمی نے فرط عقیدت سے مجبور ہو کر میری دونوں جیبیں کاٹ دیں اور ان میں سے ہوٹلوں کے بل نکال کر لے گئے۔ ایک اور آدمی ہجوم کو چیرتا ہوا میری طرف بڑھا۔ قریب آ کر اس نے اپنے رومال سے میری داہنی مونچھ جھاڑی اور اس پر ایک بوسہ دیا اور جیب سے سموسہ نکال کر کھانے لگا۔ میں نے پوچھا۔

"بھائی یہ بوسہ اور سموسہ کیا ہوا؟" اس پر وہ مرد بدلگام لیکن خوش کلام یوں بولا۔

"وہی جو غمزہ اور شرغمزہ ہوتا ہے"

میں دماغ ہی دماغ میں اس کی عقل پر دنگ رہ گیا۔ اتنے میں لوگ مجھے دھکیلتے ہوئے اسٹیشن سے باہر لے آئے۔ باہر آ کر ان میں سے ہر ایک نے مجھ سے باری باری مصافحہ کیا اور میرے گلے سے اپنا اپنا ہار اتار کر چلتے بنے۔

ایکا ایکی ایک تانگہ میرے قریب سے گزرا جسے دیکھ کر میرے کندھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس لئے کہ اس کی پچھلی سیٹ پر ایک لمبے منہ والا گھوڑا حاجیوں والا زرد رومال سر پر باندھے عینک لگائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ یا الٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل ——— یہ میں کون سے

شہر میں آگیا ہوں!

خیر تو میرے بھائیو! میں وہاں ایک بازار کی جانب چل پڑا۔ ایک جگہ مجھے کچھ بھیڑ نظر آئی۔ پاس جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کتا زمین پر نیم جان سا لیٹا ہوا ہے اور اس کی ٹانگ میں سے خون بہہ رہا ہے۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اسے ایک آدمی نے کاٹ کھایا ہے قریب تین چار کتے کھڑے تھے۔ ایک کتے نے کان میں انگلی پھیرتے ہوئے دوسرے کتے سے کہا۔

"اے فوراً ٹیکے لگوانے چاہئیں!"

اتنا سُن کر چپکے سے ایک طرف کھسک گیا کیونکہ میرے آس پاس بہت سے آدمی کھڑے تھے۔

جس بازار میں سے میں گذر رہا تھا وہ کافی بارونق تھا۔ دونوں طرف کی دوکانیں خوبصورت اور آراستہ و پیراستہ تھیں۔ چونکہ رمضان شریف کا مہینہ تھا۔ اس لئے لوگ جوق در جوق ریستورانوں میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک بہت بڑے ریستوران کے دروازے پر یہ چھوٹا سا بورڈ لٹک رہا تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"یہ ہوٹل رمضان شریف کے احترام میں بند ہے۔

(نوٹ) کھانا کھانے کے لئے پچھلی گلی سے تشریف لائیں"

میں ابھی بورڈ پڑھ ہی رہا تھا کہ نزدیکی دوکان میں سے دو ننگ دھڑنگ آدمی بھاگتے ہوئے نکلے اور سامنے والی گلی میں گم ہو گئے۔ میں نے غور سے دیکھا تو دوکان کی پیشانی پر سرخ الفاظ میں لکھا تھا۔

"یہاں بھاگتے چوروں کی لنگوٹیاں بکتی ہیں"

میں وہاں سے بھاگنے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے اپنی لنگوٹی کا خیال آگیا

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

اور میں پہلے سے بھی زیادہ آہستگی سے چلنے لگا۔ کچھ دور چلنے پر میں نے دیکھا کہ دو آدمی کسی بات پر بڑی گرما گرمی سے جھگڑا کر رہے تھے۔ ایک آدمی دوسرے سے کہنے لگا۔

"میں تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا!"

دوسرے آدمی نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔

"دیکھ لوں گا جب تم اینٹ سے اینٹ بجاؤ گے۔"

اس پر پہلے آدمی نے آگے بڑھ کر سڑک پر سے دو اینٹیں اٹھائیں اور انھیں ہاتھوں میں لیکر آہستہ آہستہ بجانے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ جھاڑے اور ایک طرف چل پڑا۔ بس پھر کیا تھا۔ دوسرے لوگ ہاتھ جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اسی ہجوم میں اچانک ایک لڑکا بزرگ صورت آدمی کو کان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر نکال لایا اور آنکھیں لال کرتے ہوئے گرجا۔

"ابا جان! میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ دوپہر کے وقت گھر سے باہر نہ نکلا کریں۔ مگر آپ سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔"

اس بزرگ صورت آدمی نے منہ لٹکا کر اور کانپتے ہوئے کہا۔ "بیٹا جان! میں تو زمیندار اخبار لینے آیا تھا۔" لڑکے نے کان چھوڑ کر اپنی قمیص کا کالر ٹھیک کیا اور کہا۔

"اب سیدھے گھر جائیے اور اسکول کا سبق یاد کیجئے۔"

"مائی گڈنس! کیسے والدین سے سابقہ پڑا ہے۔"

میرے ہم شکل اور میرے ہم عقل بھائیو! میں بھائیوں کی دوکان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ششدر ہو کر رہ گیا اور وہاں سے جلدی جلدی بھاگ نکلا۔ آگے بڑے چوک کے وسط میں ایک خوبصورت فوارہ لگا تھا جس میں سے

پانی ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر باہر ابل رہا تھا۔ فوارے کے پیچھے ایک پرندہ بیٹھا تھا جو اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا تھا اس کے اوپر ایک اور پرندہ درخت کی شاخ پر بیٹھتا تھا۔ ترازو اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ پلڑوں میں پر ڈالے انھیں تول رہا تھا۔ فوارے کی دائیں جانب میں نے سبز سبز گھاس پر ایک بڑے ہی پیارے اور معصوم صورت گڈے سے بچے کو دیکھا جو چھوٹے چھوٹے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ اور خود بخود ہنس رہا تھا۔ بچہ مجھے اس قدر پیارا لگا کہ میں جو کبھی بچوں کو پیار نہیں کرتا اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے بڑی محبت سے اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔

"ہیلو بے بی، ہیلو سویٹ بے بی' اور ہیلو گڈی! بسکٹ کھاؤ گے؟"

بچے نے اچانک کھلونے ہاتھ سے رکھ دیئے نیکر کی جیب سے لائبریری فریم والی عینک نکال کر آنکھوں پر لگائی اور مجھے گھورتے ہوئے بھاری آواز میں بولا۔

"مسٹر! مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرو۔"

اے اللہ کے درویشو! اتنا سننا تھا کہ میری پگڑی اچھل کر مجھ سے دور جا گری جب میں وہاں سے بھاگنے لگا تو بچہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر یہ شعر پڑھا۔

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
میں خود "لایا" نہیں "آیا" گیا ہوں

میرے حواس ابھی ٹھکانے پر نہیں آتے تھے۔ میں انھیں ٹھکانے پر لانے کے لئے ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جب میرے حواس مکمل طور پر جمع ہو گئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پاس ہی دستار اور عمامہ پوش ایک بوڑھے بزرگ تشریف فرما ہیں اور کچھ پڑھ رہے ہیں۔ ان کا منہ کتاب نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے

سوچا کر چلو ان سے ذرا دو دو باتیں ہی کر لیں۔ میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

کیوں صاحب آج موسم کیسا ہے؟

دوسری طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ میں نے کان صاف کرتے ہوئے اپنا سوال پھر دُہرایا۔ جواب میں حسب سابق خاموشی طاری رہی۔ تیسری مرتبہ استفسار کرنے پر وہ بزرگ کتاب پر سے نظر ہٹا کر مجھے قہر بھری نگاہوں سے گھورنے لگے۔ انھیں دیکھکر میرے بنچ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ وہ بزرگ منہ میں چوسنی لئے جلدی جلدی شہد چوس رہے تھے۔ میں وہاں سے سر پر جوتے رکھ کر بھاگا اور شہر کی سب سے بڑی سڑک پر آکر دم لیا۔ لیکن یہاں آکر عجیب ہی تماشہ دیکھا۔ چوک میں ٹریفک کا سپاہی بے شمار سائیکل سواروں کے درمیان کھڑا ان کا چالان کر رہا تھا۔ اگرچہ دھوپ کافی روشن تھی۔ پھر بھی ان لوگوں کا محض اس لئے چالان ہو رہا تھا کہ وہ صبح کے وقت بغیر بتی کے سائیکل چلا رہے تھے۔ ایک کوچوان میری پگڑی دیکھکر تانگہ میرے پاس لا کر بولا۔

"داتا کے دربار چلیئے گا جناب؟"

میرے انکار پر کوچوان نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"سرکار پلک جھپکنے میں پہنچا دوں گا۔ پندرہ ہارس پاور کا گھوڑا ہے"

میں نے ڈر کر گھوڑے کی طرف دیکھا۔ گھوڑے نے گردن گھما کر مجھے دیکھا اور ناک چڑھا کر بولا۔

"جھوٹ بکتا ہے، میں صرف ایک ہارس پاور ہوں"

جوں جوں شام ہو رہی تھی میرے درویش بھائیو! میرے دل کو یہ فکر دامن گیر تھا کہ رات کہاں گزاری جائے۔ گھومتے گھومتے میں شہر کی چار دیواری میں آگیا۔ یہاں ایک جگہ قوالی ہو رہی تھی، جلسے سج رہے تھے اور قوال جھوم

جھوم کر یہ دوہا بار بار پڑھ رہے تھے ؎

اک ماجرا سناتا ہوں میں حسن و عشق کا
"لے لی" کا ایک عاشق دیوانہ قیس کا
بعد فنا تھے دونوں کے مرقد جدا جدا
لیکن وہ دونوں قبروں سے آتی تھی یہ صدا
کیا؟
تیرے کھڑے تے کالا کالا تل وے
وے منڈیا سیالکوٹیا

پہلے قوال اُٹھے تو ایک اور قوال صاحب تشریف لائے۔ جو ٹیلر ماسٹر تھے۔ انھوں نے بیٹھتے ہی گانا شروع کر دیا ؎

میں نے لاکھوں کے کوٹ سیئے، ستمگر تیرے لئے

اس پہلے ہی مصرعے سے لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اُٹھ کر ناچنا شروع کر دیا اور اپنے اپنے کوٹ پھاڑ ڈالے۔ درزی قوال کے شاگرد آگے بڑھے اور آن کی آن میں سارے کوٹ جمع کر کے لے گئے۔ میں نے اپنے کوٹ کے بٹن بند کئے اور آگے چل پڑا۔

اے میرے پیارے چوتھے درویش! اس سے پیشتر کہ میں کہانی کا آخری حصہ بیان کروں تو اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں اپنا داہنا ہاتھ ڈال کر بگلے کا ایک سگریٹ مجھے پلا، تاکہ میرے حواس باطنہ کے حواس خمسہ اس سے لطف اندوز ہوں!

اس پر چوتھے درویش نے رونی صورت بناتے ہوئے بگلے کا سگریٹ نکالا اور پہلے درویش کو دیا۔

بگلے کے سگریٹ کا کش کھینچکر پہلا درویش ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا اور اپنی داستان بیان کرنے لگا۔

بھائیو! شام پڑ چکی تھی، میں نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ اس شہر میں شام کے وقت خوش حال لوگ دسترخوان پر کھانا چن کر مہمانوں کی تلاش میں گلیوں میں چکر لگایا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی امید میں میں بھی گلیوں میں گھومنے لگا۔ ایک گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اچانک کسی نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور دو آدمی مجھے اٹھا کر کسی پراسرار ہوٹل میں لے گئے۔ مجھے کرسی پر بٹھلا کر ایک نے پستول نکال کر باہر رکھ دیا اور باقی دونوں آدمی کرسیاں کھینچکر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا۔

"ہمیں کھانا کھلاؤ یا ہماری گولیاں ٹھنڈی کرو۔"

میں سناٹے میں آگیا۔ انھوں نے اس دوران میں طرح طرح کے کھانوں کا آرڈر دیا اور کھا پی کر بل میرے حوالے کر کے چلتے بنے۔ میں اٹھتے ہوئے بل ہوٹل کے منیجر کے حوالے کر دیا اور ہوٹل کے منیجر نے مجھے حوالہ پولیس کر دیا اور پولیس مجھے حوالات میں لے گئی۔ اتفاق دیکھیے کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے کلاہ میں ایک قیمتی پتھر جڑا ہوا ہے۔ اسے بیچ کر میں نے جوہری سے ساڑھے گیارہ روپے وصول کیے۔ پانچ روپے حوالات کے داروغہ کو دیئے۔ پانچ روپے میں ان لوگوں کا بل ادا کیا جو میزبان کی تلاش میں رات کو گلیوں میں گھوما کرتے ہیں۔ اور باقی پیسے جیب میں ڈال کر "چاک ٹی ہاؤس" میں جا بیٹھا اور چائے پینے لگا۔

میرے بالکل سامنے ایک لمبے ناک والا آدمی پلیٹ میں برف ڈالے اس کے ساتھ روٹی کھا رہا تھا۔ ایک اور آدمی آئس کریم میں کھیرے کے

"بقیس ـــــــ تھریسانٹس کے لئے ـــــــ اداویلی میں ـــــــ اور پھر وہ کہتی ہے، اداویلی میں؟" اور سیسو کہتی ہے مردوں کو یوں ہمارا مذاق اڑانے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ اگر بقیس کی جگہ میں ہوتی تو ضرور پوچھ گچھ کرتی"........

اور سیسو دو ہی قدم آگے بڑھتی ہے کہ اسے دیوار پر لکھا ہوا ملتا ہے ـــــــ ندوس کی سیسوٹامئن کے لئے ـــــــ ایک منا.......

تھوڑی دیر کے لئے سیسو کا رنگ زرد ہوتا ہے اور پھر وہ اس تحریر کے نیچے کھڑی ہو جاتی ہے اور انتظار کرتی ہے جبکہ باقی عورتیں اسے رشک اور حسد کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گزرنے لگتی ہیں.......

سندر لال امرتسر (سرحد) جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اسے لاجو کے آنے کی خبر ملی۔ ایک دم ایسی خبر مل جانے سے سندر لال گھبرا گیا اس کا ایک قدم فوراً دروازے کی طرف بڑھا لیکن وہ پیچھے لوٹ آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ روٹھ جائے اور کمیٹی کے تمام پیکارڈوں اور جھنڈیوں کو بچھا کر بیٹھ جائے اور پھر روئے لیکن وہاں جذبات کا یوں مظاہرہ ممکن نہ تھا۔ اس نے مردانہ وار اس اندرونی کشاکش کا مقابلہ کیا اور اپنے قدموں کو ناپتے ہوئے چوکی کلاں کی طرف چل دیا۔ کیونکہ یہی جگہ تھی جہاں مغویہ عورتوں کی ڈلیوری دی جاتی تھی۔

اب لاجو سامنے کھڑی تھی اور ایک خوف کے جذبے سے کانپ رہی تھی وہی سندر لال کو جانتی تھی اس کے سوا اسے کوئی نہ جانتا تھا وہ پہلے ہی اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا کرتا تھا اور اب جب کہ وہ ایک غیر مرد کے ساتھ زندگی کے دن بتا کر آئی تھی، نہ جانے کیا کرے گا۔ سندر لال نے لاجو کی طرف دیکھا۔ وہ خالص اسلامی طرز کا کالا دوپٹہ اوڑھے تھی اور بائیں بُکل مارے ہوئے تھی........

تلے ڈال کر نوش جان کر رہا تھا۔ بچی ہوئی آئس کریم اس نے بٹوے میں ڈالی بوٹ کے تسمے کھول کر روپے کا نوٹ نکالا۔ بل پر دستخط کئے اور ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ ایک نوجوان لڑکا چائے کی پیالی سامنے رکھ کر زار زار رو رہا تھا اور بار بار ایش ٹرے اٹھا کر اس میں آنسوؤں کے قطرے گرا رہا تھا۔ سگریٹ ابھی ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے اُسے چائے کے پیالے میں ڈال کر بجھایا۔ ادھر ادھر دیکھ کر ایش ٹرے جیب میں ڈال کر ہوٹل سے باہر نکل گیا جہاں وہ بیٹھا تھا اس کے عین اوپر لکھا تھا۔

"براہِ مہربانی سگریٹ پیالوں میں مت بجھائیے اور اگر
آپ ایسا کرنے پر مجبور ہیں تو بیرے کو کہیے کہ چائے
ایش ٹرے میں لائے۔" "منیجر"

میں اُٹھنے ہی والا تھا کہ دو گنجے سروں والے بقراط ٹائپ آدمی اندر آئے۔ بڑی احتیاط سے میز کے گرد بیٹھ کر انھوں نے ایک پلیٹ بکری کے مغز کا آرڈر دیا اور جب مغز آیا تو بڑی خاموشی سے مغز کھانے لگے۔ اس ہوٹل سے باہر نکل کر میں نے سوچا کہ کہاں جاؤں؟ کدھر جاؤں؟ دو ادیب میرے پاس سے گاتے ہوئے گزر گئے ؎

من کا پنچھی بول اٹھا ہے
بول سجن تیری جیب میں کیا ہے؟ ..... جیب میں کیا ہے۔
میری جیب کی بات نہ پوچھو
ہائے کوئی پیسہ نہیں
.....

اب میرے سامنے کوئی منزل مقصود نہ تھی۔ چنانچہ میں نے یونہی بے مقصد

گھومنا شروع کر دیا۔ مصری شاہ کے سامنے باغ میں مجھے دو پولیس کے سپاہیوں نے روک لیا۔

"کون ہو تم؟"

میں نے کہا "پہلا درویش!"

میرا اتنا جواب سُنکر وہ مجھے پکڑ کر تھانے لے گئے اور آوارہ گردی کے جرم میں مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا اس حوالات میں میری ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو قتل کے جرم میں وہاں رات بھر کیلئے رکھا گیا تھا۔ اسکے خلاف الزام یہ تھا کہ اس نے ایک آدمی سے نیکی کی تھی اور پھر اس آدمی کو دریا میں ڈالدیا تھا۔

رات بھر میں اس آدمی سے ڈر کر ایک کونے میں دبکا بیٹھا رہا اور وہ آدمی چیخ چیخ کر پکارتا رہا "نیکی کر دریا میں ڈال"

خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور پولیس والوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ باہر نکل کر میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے دم نکل آتی ہے۔ میں نے جلدی سے اسے دبایا اور اسٹیشن کی طرف بھاگ اُٹھا۔ کہیں گانا ہو رہا تھا۔

میری گٹھڑی کو لاگا چور

مسافر بھاگ ذرا ......

"اور اے درویش بھائیو! اب میں نے اس تکیئے میں آکر دم لیا ہے اور انشاءاللہ اسی جگہ دم دوں گا"

یہ قصّہ سُنکر دو درویش تو ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور تیسرے درویش نے اُچھل کر کہا۔

"بھائی! خدا کیلئے مجھے یہ قصّہ قلمبند کرنے دے میں نیا نیا اخبار کا ایڈیٹر ہوا ہوں"

"ہونا قریب الاختتام پہلے درویش کے قصّے کا"

(چٹان۔ لاہور)

مرزا ادیب

مائی پھاتاں

اس دن سارا شہر شیخ خیر الدین مرحوم کا پہلا جنم دن منا رہا تھا!
یہ دن منانے کے لئے کئی ہفتوں سے بڑی شد و مد کے ساتھ تیاریاں ہو رہی تھیں چنانچہ اخبارات کے خاص نمبر شائع ہو رہے تھے، رسائل و جرائد میں مرحوم کی تصاویر چھاپی جا رہی تھیں اور اتوار کی شام کو کارپوریشن کے میئر کی زیر صدارت ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان عام جلسہ بھی ہو رہا تھا۔ اس جلسے میں شہر کی کئی مشہور و ممتاز ہستیاں مرحوم و مغفور کی زندگی کے واقعات پر روشنی ڈال رہی تھیں اور مجھے بھی اسی سلسلے میں مدعو کیا گیا تھا۔ مجھے مرحوم سے ذاتی واقفیت تھی اس کے علاوہ اخبارات و رسائل میں چھپے ہوئے مضامین کے مطالعے کے بعد میرے پاس اتنا مواد جمع ہو گیا تھا کہ ان کے بارے میں ایک تقریر کیا کم سے کم دس لمبی چوڑی تقریریں تیار کر سکتا تھا مگر میں چاہتا تھا کہ جو کچھ لکھوں وہ مرحوم کی زندگی کے صرف ایک ہی پہلو سے متعلق ہو اور اس

کے لئے میں نے جو موضوع منتخب کیا تھا وہ تھا شیخ خیر الدین آبخانی کے احسانات عام لوگوں پر۔ مواد آنکھوں کے سامنے بکھرا پڑا تھا اور میرا قلم بڑی تیزی سے اسے سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ صاحب مرحوم شہر کے مشہور رئیسوں میں تھے آبائی وراثت میں آپ کو کافی جائداد ملی تھی اس کے علاوہ اپنی ذاتی کوششوں سے بھی آپ نے دولت میں کافی اضافہ کر لیا تھا۔ مگر دیکھنے والی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ مرحوم نے اپنی دولت کو کہاں کہاں خرچ کیا اور مرحوم کے نزدیک اپنے سرمائے کا حقیقی مصرف کیا تھا۔ شیخ صاحب بے نواؤں کا آسرا اور یتیموں کا ملجا تھے۔ ساری عمر خلقِ خدا کی خدمت کرتے رہے آپ نے اپنی آمدنی کا ایک خاص حصہ لوگوں کی بہتری کے لئے وقف کر رہا تھا۔ اُستاد ذوق کا ایک شعر ہے۔

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

اور مرحوم اس شعر کی زندہ تفسیر تھے۔ آج خیر الدین ہسپتال کا نام کون نہیں جانتا؟ اس ہسپتال میں روزانہ بیسیوں مریضوں کا علاج ہوتا ہے اور اکثر مریضوں کو دوا بالکل مفت دی جاتی ہے۔ مرحوم نے صرف یہ ہسپتال ہی نہیں اپنی جیب خاص سے ایک معقول رقم صرف کر کے ایک یتیم خانہ بھی تعمیر کروا دیا تھا اور آج بھی اس یتیم خانے میں قوم کے کئی بے نوا اور بے آسرا بچے پرورش پا رہے ہیں، بے یار و مددگار لوگوں کو سہارا دینا مرحوم ہی کا کام تھا

"باؤ جی! ایک خط لکھ دو گے؟"

میرا قلم چلتے چلتے رُک جاتا ہے۔ سر اُٹھا کر سامنے دیکھتا ہوں، مہراں گوالن اپنے میلے ہاتھوں میں خالی لفافہ پکڑے دہلیز پر کھڑی ہے۔

"خط لکھ دونا۔ پھر ست نہیں ہے؟"

جانتا ہوں کہ اگر اس وقت تمام خیالات کو سمیٹ نہ لیا تو بعد میں عبارت کا ربط و تسلسل ٹوٹ جائے گا اور لکھنے میں وہ آسانی باقی نہیں رہے گی جو اس وقت حاصل ہے مگر کیا کیا جائے، انکار کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ مہراں گزشتہ دس سال سے بغیر پانی ملائے دودھ مہیا کر رہی ہے اور یہ اس کا بہت بڑا احسان ہے انکار احسان مندی کے خلاف ہو گا۔ چنانچہ میں سر کے اشارے سے اسے اندر آنے کے لئے کہتا ہوں۔ مہراں اندر آتی ہے اور فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتی ہے۔

باؤ جی تکلیف تو ہو گی۔ میری بہن کو لکھنا ہے جو راولپنڈی رہتی ہے تحصیل"۔
بھئی پہلے بتاؤ لکھنا کیا ہے۔ پتہ بعد میں لکھا جاتا ہے۔ ذرا ٹھہرو۔ کاغذ لے لوں۔ ہاں اب بولو"۔

"بس یہ لکھنا ہے، کہ جمعرات کی شام کو مائی پھاتاں مر گئی ہے"۔

یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ فاطمہ کو مائی پھاتاں کے مرنے کا بڑا دکھ ہو گا۔ مائی پھاتاں کو اس کا بڑا خیال رہتا تھا۔ جب فاطمہ کنواری تھی تو ایک دفعہ اس کا پاؤں ذرا جل گیا تھا۔ پھاتاں سارا دن گھومتی رہی اور اللہ جانے کہاں سے مرہم لے کر آئی۔ اس دن اللہ ماری ہڑتال تھی سارے شہر میں"۔

"مائی پھاتاں دہی تھی نا ——— دھوبن" میں پوچھتا ہوں۔

گلی کے آخری مکان میں تو رہتی تھی۔ آپ کے کپڑے دھوتی ہو گی۔ سارے محلے کے کپڑے دھوتی تھی وہ تو"۔

یہی بات ہے پرسوں اس گھر کے سامنے چند آدمی بیٹھے تھے ——— تو مائی پھاتاں مر گئی ہے۔

"کیا کہوں کتنی ہمت والی تھی وہ کام کر کے تھکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی تو یہ عورت تھی کہ لوہے کی بنائی ہوئی مشین؟" مہراں تعریفی لہجے میں کہتی ہے۔

"اور اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ بڑی لڑاکا تھی ہر وقت لڑتی رہتی تھی محلے کے لوگ اس سے پناہ مانگتے تھے" میں پھاتاں کی وہ خصوصیت بتاتا ہوں جس کا شہرہ عام ہے اور جس کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے۔

"لڑتی تو وہ ضرور تھی اور شور بھی بہت مچاتی تھی پر اپنے خصم سے لڑتی تھی۔ لوگوں نے اسے اللہ جانے بدنام بھی کر دیا تھا۔ میں بتاؤں تم کو، کس قسم کی عورت تھی وہ تھی ——— بڑی اچھی۔ ہائے آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ کیوں باتیں کروں؟"

میں تقریر دانے کا غذ پر نظر ڈالتا ہوں ——— بے یار و مددگار لوگوں کو سہارا دینا مرحوم ہی کا کام تھا ———" اگلا فقرہ سوچنے کے لئے میں پیشانی بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر، آنکھیں بند کر کے سوچنے لگتا ہوں۔

دنیا میں بہت کم ایسے آدمی ہوں گے جنھوں نے ٹوٹے ہوئے دل جوڑے ہوں مظلوموں کو سہارا دیا ہو اور جو بیکسوں کا آسرا بنے ہوں۔ شیخ صاحب کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ گرے ہوؤں کے سچے دوست تھے" ——— میرے ذہن میں پورا فقرہ الفاظ کی مناسب ترتیب کے ساتھ آجاتا ہے۔ میں قلم ڈھونڈنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ مہراں ٹرمٹر میری طرف دیکھ رہی ہے۔ نہ جانے کیا سوچ رہی ہے۔ کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس کی خاموش نگاہیں ایک التجا لئے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک خاص آرزو کی جھلک ہے۔ جی چاہتا ہے اس کی دو چار باتیں سن لوں، زیادہ سے

زیادہ دو منٹ صرف ہوں گے اس کے بعد شیخ مرحوم کے چند واقعات لکھ کر تقریر مکمل کر دوں گا۔ اور میں کہتا ہوں۔

تو وہ لڑاکا نہیں تھی ـــــ تمہاری مائی پھاتاں۔

ضرور تھی ـــــ میں کہتی ہوں، ہاں تھی، اللہ بخشے میرے مراد کے میاں کو۔ جب میں اس کے گھر میں آئی اس سے بیاہ کر کے تو وہ کہنے لگا۔ دیکھو مہراں! اس پھاتاں سے پرے پرے رہنا۔ کسی دن لڑ پڑی تم سے تو تمہارے سر کا ایک بال بھی نہیں چھوڑے گی۔ میں نے کہا میں بھی کسی سے دبنے والی نہیں ہوں مجھ سے لڑے گی تو منہ کی کھائے گی ـــــ یہ بات تو میں نے کہدی پر پھاتاں سے ملتے ہوئے مجھے سچ مچ ڈر لگتا تھا۔ اس نے کئی بار بلانا چاہا مگر میں الگ الگ ہی رہی۔ ابھی میرے بیاہ کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا ہوگا کہ پھاتاں کی اپنے خصم مولا بخش سے ایسی لڑائی ہوئی ـــــ ایسی لڑائی ہوئی کہ کیا کہوں، پھاتاں نے تو سر پہ آسمان اٹھا لیا اس دن میں نے عہد کر لیا کہ میں اس سے کبھی نہ ملوں گی۔ پتہ ہے۔ لڑائی کی وجہ کیا تھی۔ وجہ یہ تھی کہ پھاتاں نے کہیں سے سُن لیا تھا کہ مولا بخش کا کسی میراثن سے یارانہ ہو گیا ہے۔ اور وہ اس کے گھر میں آتا جاتا رہتا ہے۔ پھاتاں کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی یہ سن کر۔ مراثن کو وہ بے نقط سنائیں کہ توبہ ہی بھلی ـــــ ـــــ آدھی رات تک اس نے محلے والوں کو سونے نہ دیا

پر آپ کا وقت بڑا قیمتی ہوگا۔ میں کیا پھاتاں کی کہانی لے بیٹھی ہوں مہراں بولتے بولتے یک لخت بے چین ہو جاتی ہے۔

"نہیں تم پھاتاں کی لڑائیوں کا حال ضرور سناؤ" میں بخوشی کہتا ہوں۔

تیسرے دن پھر لڑائی ہوئی۔ مولا بخش نے کہہ دیا کہ وہ مراثن کے گھر ضرور جایا کریگا بس پھاتاں تو بھوکی شیرنی بن گئی۔ اس دن اس کا چچا بھی آگیا اور اس نے غصہ میں آکر مولا بخش کی بانہہ کی ہڈی توڑ ڈالی۔ شاید دوسرے یا تیسرے دن کا قصہ ہے کہ میں کسی گاہک کو دودھ دے رہی تھی اتنے میں دیکھتی ہوں کہ پھاتاں چھوٹا سا گلاس ہاتھ میں لئے میرے پاس کھڑی ہے۔

"بہو تھوڑا سا دودھ دے دو" پھاتاں نے کہا

میں نے اسے دودھ دے دیا۔ خیال تھا دودھ لے کر چلی جائے گی۔ پر وہ تو دھرنا مار کر وہیں بیٹھ گئی۔ اور لگی باتیں سنانے۔ پہلے تو وہ کہنے لگی مولا بخش کو بڑی تکلیف ہے بیچارہ ساری رات تڑپتا رہا ہے اور میں دو راتوں سے بالکل نہیں سوسکی۔ پھر وہ اپنے گھر کے حالات بتانے لگی ——— اس دن مجھے پتہ لگا کہ پھاتاں دل کی بری نہیں ——— باؤ جی وہ کیسے بُری ہوسکتی تھی اس کا خصم ایک مراثن سے یارانہ کر رہا تھا پر پھر بھی جب وہ زخمی ہوتا ہے تو وہ ساری ساری رات جاگ کر اس کی خدمت کرتی ہے اور اپنی بوڑھی ساس کی تو وہ اس دن سے خدمت کر رہی ہے جس دن اس کا بیاہ ہوا تھا۔ میرا شک شبہ جاتا رہا اور میں اس کے گھر آنے جانے لگی! ———

بیماری میں مولا بخش نے کہہ دیا تھا کہ اب وہ مراثن کے گھر کبھی نہیں جائے گا۔ مگر جیسے ہی وہ ٹھیک ہوا وہ پھاتاں کی سونے کی چوڑیاں چرا کر فوراً ادھر بھاگا اور مراثن کو وہ چوڑیاں دے آیا۔

پھاتاں کے رشتہ داروں نے کہا کہ وہ مولا بخش کو چھوڑنے پر وہ اس پر راضی نہ ہوئی میکے چلی گئی اور ایک مہینے کے بعد پھر آگئی ——— اللہ جانے اسے کیوں اپنے ایسے بُرے خصم کا خیال رہتا تھا۔ میں ہوتی اس کی جگہ تو

پتہ ہے کیا کرتی کبھی ادھر کا رُخ نہ کرتی سچ کہتی ہوں، اچھا تو ایک دن کا ذکر ہے میں کوٹھری میں بیٹھی روٹی کھا رہی تھی کہ ایک عورت آئی۔ کوئلے کی طرح کالا سیاہ رنگ قندھاری انار کی طرح سُرخ آنکھیں اور گلے میں موتیوں کی مالا۔ میں نے کہا یا الٰہی کون ہے اور کیوں یہاں آئی ہے وہ عورت کوٹھے مٹکاتی ہوئی آئی اور میرے پاس موندھے پر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا بہن تو کدھر سے آئی ہے اور کیا کام ہے۔ اس پر وہ بولی میرا نام داراں ہے مصری شاہ میں رہتی ہوں۔ ذرا مولا بخش کو بلا دو۔

میں بولی "ہائے تو تو وہی ہے مراثن۔ ہے نا ——— نہ بابا! میں تو اس کام میں نہیں آؤں گی۔ اگر پھاتاں نے سُن لیا کہ تو یہاں ہے تو وہ اللہ جانے کیا کرے۔ بڑی سخت عورت ہے۔ سارا محلہ اس سے ڈرتا ہے۔

یہ سُن کر وہ بولی "بہن! اب میں کہاں جاؤں۔ گھر والوں نے مجھے نکال دیا ہے۔ کہتے ہیں تو وا گدار ہو گئی ہے۔ مولا بخش کو ذرا بلا دو نا۔ اس سے پوچھوں اب وا گذار کر کے مجھے کس کے حوالے کرتا ہے بدمعاش کہیں کا"۔

میں نے کہا "یہ تو میں نہیں جانتی کہ اب تم کہاں جاؤ پر میں اس کام میں نہیں آؤں گی کبھی تو نے پھاتاں کو دیکھا نہیں۔ اس نے اگر تجھے دیکھ لیا یہاں تو تیری ہڈیاں تک پیس ڈالے گی ہاں اللہ جانے بڑی سخت عورت ہے چپ چاپ یہاں سے چلی جا۔ اسی میں تیری خیریت ہے"۔

وہ بولی "میں تو ضرور اس سے ملوں گی۔ کئی دن سے وہاں نہیں گیا۔ اللہ اسے کسی کی آئے کیوں آیا تھا میرے گھر۔ اگر بہن! تو مولا بخش کو نہیں بلاتی تو میں خود اس کے گھر چلی جاتی ہوں"۔

باؤ جی! وہ تو پھاتاں کے گھر جانے کے لئے تیار تھی پر جب میں نے

خوب ڈرایا تو کہنے لگی اچھا راولپنڈی چلی جاتی ہوں۔ وہاں میرا ماموں رہتا ہے۔ اور وہ باہر نکل گئی ——— گلی میں اندھیرا تھا۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھ نہ سکی۔ سمجھ لیا اب تو اس قدر ڈر گئی ہے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھے گی۔

صبح میں پھاتاں کے گھر گئی تو جو کچھ میں نے دیکھا وہ بڑا عجیب تھا۔ پھاتاں کپڑوں پر استری کر رہی تھی اور وہ ——— بھلا کون ——— وہ مراثن پھاتاں کی سوکن ——— مونڈھے پر بیٹھی دہی کے ساتھ رات کی بچی ہوئی روٹی کھا رہی تھی۔ میں حیران رہ گئی۔ پھاتاں کہنے لگی۔ "مہراں! جانتی ہو۔ یہ کون ہے؟"

میں نے کہا: نہیں ——— جھوٹ موٹ کہدیا نا

کہنے لگی "یہ وہی نوچی ہے داراں مراثن"

"تو یہ یہاں؟"

"ہاں بہو! کہتی ہے مجھے گھر والوں نے نکال دیا ہے۔ میرا کوئی آسرا نہیں اور میں "واگدار" ہوگئی ہوں۔ میں نے کہا اچھا تجھے گھر والوں نے نکال دیا ہے تو آجا یہاں، اللہ جو ہمیں روکھی سوکھی دیتا ہے تو بھی کھا لیا کر۔" اور داراں پھاتاں کے گھر میں رہنے لگی۔

پھاتاں کے رشتہ داروں کو جب پتہ لگا کہ داراں مراثن اس کے گھر میں آگئی ہے تو وہ یوں تلملا اٹھے جیسے بھڑوں کے چھتے کو کسی نے چھیڑ دیا ہو۔ سب نے کہا اسے فوراً گھر سے نکال دو۔ مگر پھاتاں بولی۔ میں اسے سہارا دے چکی ہوں اب تو اسے نہیں نکالوں گی۔ کہاں کہاں ماری ماری پھرے گی یہاں سے جا کر باؤجی! کیا کہوں پھاتاں کے رشتہ داروں نے بہت سختی کی۔ پھاتاں کے چچا نے یہاں تک کہدیا کہ

۔۔۔۔۔ عادتاً محض عادتاً ــــــ دوسری عورتوں میں گھل مل جانے سے یا آخر اپنے صیاد کے دام سے بھاگ جانے کی آسانی تھی اور وہ سندر لال کے بارے میں اتنا زیادہ سوچ رہی تھی اور ڈر رہی تھی کہ اسے کپڑے بدلنے یا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے کا بھی خیال نہ رہا، وہ ہندو اور مسلمان کی تہذیب کے بنیادی فرق

دائیں بکل اور بائیں بکل میں امتیاز کرنے سے قاصر رہی تھی۔ اب وہ سندر لال کے سامنے کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی۔ ایک امید اور ایک ڈر کے جذبے کے ساتھ۔

سندر لال کو دھچکا سا لگا۔ اس نے دیکھا لاجونتی کا رنگ پہلے سے کچھ نکھر گیا تھا اور وہ پہلے کی بہ نسبت کچھ تندرست سی نظر آتی تھی۔ نہیں وہ موٹی ہو گئی تھی ـــــ سندر لال نے جو کچھ لاجو کے بارے میں سوچ رکھا تھا وہ سب غلط تھا۔ وہ سمجھتا تھا غم میں گھل جانے کے بعد لاجونتی بالکل مریل ہو چکی ہو گی اور آواز اس کے منہ سے نکالے نہ نکلتی ہو گی۔ اس خیال سے کہ وہ پاکستان میں بڑی خوش رہی ہے، اسے صدمہ سا ہوا، لیکن وہ چپ رہا کیونکہ اس نے چپ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اگرچہ وہ نہ جان پایا کہ اتنی خوش تھی تو وہ چلی کیوں آئی۔ اس نے سوچا شاید ہند سرکار کے دباؤ کی وجہ سے اسے اپنی مرضی کے خلاف یہاں آنا پڑا ہے لیکن ایک چیز وہ نہ سمجھ سکا کہ لاجونتی کا سنولایا ہوا چہرہ زردی لئے ہوئے تھا اور غم، محض غم سے، اس کے بدن پر گوشت نے ہڈیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ غم کی کثرت سے موٹی ہو گئی تھی، اور صحت مند نظر آتی تھی، لیکن یہ ایسا موٹاپا تھا جس میں دو قدم چلنے پر آدمی کا سانس پھول جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔"

مغویہ کے چہرے پر پہلی نگاہ ڈالنے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا۔ لیکن اس نے سب خیالات کا ایک اثباتی مردانگی سے مقابلہ کیا۔ اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے کسی

اگر مراثن یہاں رہے گی تو کبھی تمہارے گھر میں نہیں آؤں گا۔ پھاتاں نے سب کچھ سُنا پر اس اللہ کی بندی نے داراں کو گھر سے جانے کے لئے بالکل نہ کہا۔

پھاتاں پہلے کی طرح ہی گھر کا سارا کام کرتی تھی۔ داراں زیادہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا پیشہ گانا بجانا تھا وہ استری کر سکتی تھی؟ بھٹی جھونک سکتی تھی؟ ——— اچھا تو دن گذرتے گئے۔ پھاتاں کے سب ملنے والوں نے اس کا "بیائی کاٹ" کر دیا۔ باپ نے بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔ یہ دیکھ کر داراں کہنے لگی۔ "بہن! بس اب زیادہ نہیں میں چلی جاتی ہوں اور وہ جانے لگی۔ پھاتاں نے اس کی چوٹی پکڑ لی اور گھسیٹ کر اسے اندر لے آئی اس کے بعد داراں نے جانے کا نام نہ لیا۔

پانچ چھ مہینے کے بعد داراں کے یہاں بچی پیدا ہوئی۔ بڑی کمزور تھی۔ میں تو اسے دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی کہ بچے گی نہیں پر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ بچی سنبھل گئی اور ماں کی حالت خراب ہو گئی۔ پھاتاں نے اس پر کافی رقم صرف کر دی۔ "لیڈی ڈاکٹار" کو بلایا۔ مگر وہ بچ نہ سکی۔ اس وقت عیشاں (عائشہ) دو اڑھائی مہینے کی تھی۔

ماں مر گئی تو بچی کی کون پرورش کرے، داراں نے مرتے وقت بچی پھاتاں کے حوالے کی تھی بس پھاتاں نے اسے چھاتی سے لگا لیا اور اپنی بچی جان کر پالنے لگی۔ اللہ جانے پھاتاں کو بچی سے کیوں اتنا پیار ہو گیا تھا کہ وہ اسے گود سے اُتارنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی!"

مہراں کو پھر اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اس نے میرا کافی وقت ضائع کر دیا ہے چنانچہ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس خالی لفافے کو

دیکھنے لگتی ہے جسے وہ ساتھ لائی تھی اور جو اب چارپائی پر میرے کاغذوں کے انبار کے اوپر پڑا تھا۔

"یہ بچی زندہ رہی ——— !" میں سوال کرتا ہوں۔

مہراں کے گھٹنے پھر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور وہ جلدی سے کہتی ہے۔

"جی ہاں زندہ رہی پر پھاتاں کے لئے تو ایک مصیبت بن گئی۔ تم پوچھو گے کس طرح ——— وہ اس طرح کہ جب تک مراثن زندہ رہی لوگ پھاتاں سے کہتے رہے یہ فاحشہ عورت ہے اسے فوراً گھر سے نکال دو اور جب وہ مرگئی تو وہ بولے۔ یہ بچی اللہ جانے مولا بخش کی ہے بھی یا نہیں۔ اسے اس کی نانی کے گھر بھجوا دو۔ سُنا باؤ جی۔ مطلب یہ کہ بچی کے بارے میں ان کو شک شبہ تھا۔ تو ایک دن پھاتاں کے گھر برادری کے سب لوگ جمع ہوئے اور کہنے لگے۔ دیکھو پھاتاں ہم اب تک تمہارا منہ دیکھتے رہے ہیں۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ اسے اس کی نانی کے یہاں بھجوا دو، اسی وقت ورنہ ہم سے بُرا کوئی نہ ہوگا ——— اس وقت پھاتاں نے پتہ ہے کیا کیا۔ وہ سینہ تان کر بولی "میں اس معصوم (معصوم) کو کبھی نہیں چھوڑونگی"۔

"اگر تم نہیں چھوڑو گی تو ہم تمہارا "بیائی کاٹ" کر دیں گے" انھوں نے کہا

"جو دل میں آئے کرو۔ میں تو اسے چھاتی سے لگا چکی ہوں۔ اب موت ہی اسے مجھ سے جدا کرے گی"۔

مہراں کے لب و لہجہ میں جوش پیدا ہو گیا ہے اور وہ اس طرح بول رہی ہے۔ جیسے سٹیج پر پھاتاں کا پارٹ کر رہی ہے۔

"تو برادری نے پھاتاں کا بائی کاٹ کر دیا ہوگا"۔

"جی ہاں مولا بخش بھی بیوی کے خلاف ہو گیا۔ پھاتاں

کے دونوں لڑکے پہلے ہی مراثن کے بہت خلاف تھے۔ وہ ماموں کے گھر چلے گئے تھے وہیں کام کاج کرتے تھے میں نے جب دیکھا کہ پھاتاں اپنی ضد سے بڑا نقصان (نقصان) اٹھا رہی ہے تو ایک دن اس سے بولی۔ "پھاتاں! اس بچی کو بھیج ہی دو۔ کیا فائدہ اسے گھر میں رکھنے کا۔ سب لوگ تمہارے خلاف ہو گئے ہیں۔"

یہ سُن کر وہ کہنے لگی۔

"نہیں بہو ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس کی ماں سے کہا تھا کہ اسے سینے سے لگا کر رکھوں گی۔ کیوں بھیجوں اسے۔ لوگ خلاف ہو گئے ہیں تو بے شک ہو جائیں۔ جب کسی کو سہارا دیا ہے تو لوگوں سے کیوں ڈریں۔"

میں نے کہا "تمہارے اپنے لڑکے بھی تو خلاف ہو گئے ہیں۔"

پھاتاں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ سی گئیں۔

"لوگ کہتے ہیں لڑکا ماں باپ کا بازو بنتا ہے پر میرے لڑکے تو اللہ کی مار ان پر۔ اچھا جو چاہیں کریں۔ میں ان سے ڈر نہیں جاؤں گی۔ اللہ ہمت دے سب کام کر لیا کروں گی۔"

اور پھاتاں سب کام کرنے لگی۔ عیشاں بڑی ہونے لگی پھاتاں نے رات دن محنت کر کے اس کا جہیز بنایا اپنی ساری پونجی اس پر صرف کر دی۔ جب عیشاں کا بیاہ ہوا تو پھاتاں بڑی خوش تھی۔ عیشاں کی شادی گجرات میں ہوئی تھی۔ وہاں کسی نے عیشاں کے سسر کو بتا دیا کہ عیشاں ایک مراثن کی بیٹی ہے۔ بس پھر کیا تھا سسرال والوں نے عیشاں کو مار پیٹ کر پھاتاں کے گھر بھجوا دیا اور بعد میں کاغذ بھی بھیج دیا۔ ادھر عیشاں طلاق لے کر گھر آئی اور مولا بخش خون تھوکنے لگا۔ پھاتاں پر دُہرا صدمہ پڑا۔

کوئی اور ہوتا تو پاگل ہو جاتا۔ پر پھاتاں نے ہمت نہ ہاری۔ لولی ساس کی بھی برابر خدمت کرتی رہی۔ خصم کی بیماری پر بھی خرچ کیا اور لوگوں کے کپڑے بھی دھوتی رہی۔

تاجی پھاتاں کا رشتے میں بھائی کا بیٹا تھا۔ بڑا آوارہ گرد تھا۔ پھاتاں نے اسے گھر میں رکھ لیا۔ یہ لڑکا کام کاج میں بڑی مدد دینے لگا اور جب پھاتاں نے دیکھا کہ تاجی ٹھیک ہو گیا ہے تو اس کی شادی عیشاں سے کر دی۔ خدا خدا کر کے پھاتاں کے سر سے یہ بوجھ بھی اُترا ——— اب سُنو مولا بخش دو سال تک بیمار رہا پھر مر گیا! دو، چار دن بعد پھاتاں کی لولی ساس بھی چل بسی۔ پھاتاں کی شادی کے بعد پورے بتیس برس زندہ رہی تھی یہ ——— پورے بتیس برس اتنے سال پھاتاں نے اس کی خدمت کی تھی۔

ایک رات پھاتاں کپڑوں پر استری کر رہی تھی کہ استری سے اللہ جانے کس طرح کوئلے نکل کر اس کے کپڑوں پر آ گرے اور بیچاری کے گھٹنے جل گئے اور صبح تک بے ہوش پڑی رہی۔ صبح عیشاں نے نیچے اُتر کر دیکھا تو اپنا سر پیٹ لیا۔ ہم سب نے مل کر اسے چارپائی پر لٹایا اور حکیم کو بلایا اور وہ ہوش میں آ گئی۔ پر اب وہ پہلی جیسی نہیں تھی۔ چارپائی سے تو اٹھ ہی نہیں سکتی تھی بیچاری۔ منگل کی رات کا ذکر ہے پھاتاں نیچے سو رہی تھی اور عیشاں، تاجی اور ان بچہ اوپر چھت پر سو رہے تھے۔ آدھی رات کو بچہ رونے لگا۔ اللہ جانے کیا تکلیف تھی اُسے۔ عیشاں کی جوانی کی نیند بالکل بے خبر سوتی رہی۔ پھاتاں سے نہ رہا گیا۔ پہلے تو اس نے آوازیں دیں پھر بھی بچہ روتا رہا تو اوپر آ گئی۔ اللہ جانے کس طرح اوپر آ گئی۔ اوپر آ کر اس نے بچہ گود میں اٹھا لیا اور عیشاں

کو جگا دیا۔ عیشاں بڑی ناراض (ناراض) ہوئی۔

"اماں تیری صلاح مرنے کی ہے۔"

اور یہ بات سچی ہی نکلی۔ پھاتاں کو ہوا لگ گئی اور وہ جمعرات کی شام کو مرگئی ——— پچاس سال لوگوں کی خدمت کرنے کے بعد مری گئی۔

مہراں کی آواز بھرّا جاتی ہے اس کی آنکھیں غمناک ہو جاتی ہیں اور وہ دوپٹے کے پلّو سے ناک پونچھتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے۔

میں سوچنے لگتا ہوں، مائی پھاتاں مرگئی ہے۔ وہ مائی پھاتاں جس نے بتیس سال تک لولی ساس کی خدمت کی۔ جس نے اس وقت اپنی سوکن کو پناہ دی جس وقت اس کے گھر والوں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور وہ بے آسرا ہو چکی تھی۔ جس نے ایسے وقت میں سوکن کی بچی کو چھاتی سے لگایا۔ جس وقت وہ ماں کے دودھ سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی تھی۔ جس نے دو سال تک بیمار شوہر کی تیمارداری کی ——— جو پچاس سال تک میرے محلے میں رہی اور جس کے بارے میں چند منٹ پہلے میں صرف یہی جانتا تھا کہ وہ ایک دھوبن ہے اور بڑی لڑاکا ہے ———

مہراں آبدیدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھتی ہے

"تو لکھدو باؤ جی!"

میں کاغذ نکالتا ہوں اور لکھنے کے لئے تیار ہو جاتا ہوں۔ مہراں آنکھیں بند کر کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے انھیں دباتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے اُبھری ہوئی ہڈی نم آلود ہو جاتی ہے۔ مہراں انگوٹھے کی ساتھ والی انگلی سے اس نمی کو خشک کرتی ہے اور ایک لمبی آہ بھر کر پوچھتی ہے۔

"لکھ لیا ہے خط؟"

"ہاں۔ پتہ بولو۔"

میں خط مکمل کر کے اس کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ وہ اٹھ بیٹھتی ہے اور جانے لگتی ہے۔ دروازے کے قریب پہنچکر رک جاتی ہے۔

"آج شہر میں جھنڈیاں کیوں لگائی جا رہی ہیں؟" مہراں پوچھتی ہے۔

"تمہیں معلوم نہیں۔ آج شیخ خیر الدین مرحوم کا جنم دن منایا جا رہا ہے۔"

"اچھا۔ شیخ خیر دین ——— میں نے انھیں دیکھا تھا۔ بہت بڑے آدمی تھے۔ پھاتاں ان کے کپڑے بھی دھویا کرتی تھی ———"

مہراں چلی جاتی ہے۔ میں تقریر مکمل کرنے کے لئے کاغذ پر جھکتا ہوں۔ ——— مجھے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا ——— میری آنکھوں کے سامنے پھاتاں کا بوڑھا چہرا ابھرنے لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے اس چہرے پر صدیوں کی محنت، صدیوں کی بے لوث خدمت کا غبار چھایا ہوا ہے۔ اس غبار میں اس کی خاموش نظریں مجھ سے ایک سوال پوچھ رہی ہیں اور میرے ذہن میں مہراں کے الفاظ گونج رہے تھے "——— خیر دین بہت بڑے آدمی تھے۔ پھاتاں ان کے کپڑے بھی دھویا کرتی تھی ———"

(سرزمین ادب۔ کراچی)

کسی نے کہا ——— نہیں لیتے مسلمان (مسلمان) کی جھوٹی عورت ——

اور یہ آواز رسالو، نیکی رام اور چوکی کلاں کے بوڑھے مجرر کے نعروں میں گم ہو کر رہ گئی تھی، ان سب آوازوں سے الگ کالکا پرشاد کی پھٹتی اور چلاتی ہوئی آواز آ رہی تھی، وہ کھانس بھی لیتا تھا اور بولتا بھی جاتا۔ وہ اس نئی حقیقت، اس نئی شدھی کا شدت سے قائل ہو چکا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا آج اس نے کوئی نیا وید کوئی نیا پران اور شاستر پڑھ لیا ہے، اور اپنے اس حصول میں دوسروں کو بھی حصہ دار بنانا چاہتا ہے.....

.... ان سب لوگوں اور ان کی آوازوں میں گھری ہوئی لاجو اور سندر لال اپنے ڈیرے کو جا رہے تھے اور ایسا جان پڑتا تھا جیسے ہزاروں سال پہلے کے رام چندر اور سیتا کسی بہت لمبے اخلاقی بنباس کے بعد اجودھیا میں داخل ہو رہے ہیں اور ایک طرف تو لوگ خوشی کے اظہار میں دیپ مالا کر رہے ہیں اور دوسری طرف انھیں اتنی لمبی اذیت دینے پر تاسف کا اظہار بھی۔

لاجونتی کے چلے آنے پر بھی سندر لال بابو نے اسی شد و مد سے "دل میں بساؤ" پروگرام جاری رکھا۔ اس نے قول اور فعل دونوں اعتبار سے اسے نبھایا۔ اور وہ لوگ جنھیں سندر لال کی باتوں میں خالی خولی جذباتیت نظر آتی تھی، قائل ہونا شروع ہوئے۔ اکثر لوگوں کے دل میں خوشی تھی اور بیشتر کے دل میں افسوس، مکان ۴۱۴ کی بیوہ کے علاوہ محلہ شکور کی بہت سی عورتیں سندر لال بابو سوشل ورکر کے گھر آنے سے گھبراتی تھیں۔

لیکن سندر لال کو کسی کے اعتنا یا بے اعتنائی کی پروا نہ تھی۔ اس کے دل کی رانی آ چکی تھی اور اس کے دل کا خلا پٹ چکا تھا، سندر لال نے لاجو کی سورن مورتی کو اپنے دل کے مندر میں استھاپت کر دیا تھا اور خود دروازے پر بیٹھا اس کی حفاظت کرنے لگا تھا۔ لاجو جو پہلے خوف سے سہمی رہتی تھی، سندر لال کے غیر متوقع نرم سلوک کو دیکھ کر

آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔

سندر لال لاجونتی کو اب لاجو کے نام سے نہیں پکارتا تھا، وہ اسے کہتا تھا — "دیوی" اور لاجو ایک ان جانی خوشی سے پاگل ہوئی جاتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سندر لال کو اپنی واردات کہہ سنائے اور سناتے سناتے اس قدر روئے کہ اس کے سب "گناہ" دھل جائیں لیکن سندر لال لاجو کی وہ باتیں سننے سے گریز کرتا تھا اور لاجو اپنے کھل جانے میں بھی ایک طرح سے سہمی رہتی تھی اور سندر لال جب سو جاتا تو صرف اسے دیکھا کرتی اور اپنی اس چوری میں پکڑی جاتی اور جب سندر لال اس کی وجہ پوچھتا تو وہ "نہیں" "یونہیں" "اونہوں" کے سوا اور کچھ نہ کہتی۔ اور سارے دن کا تھکا ہارا سندر لال پھر اونگھ جاتا ... . البتہ شروع شروع میں ایک دفعہ سندر لال نے لاجونتی کے "سیاہ دنوں" کے بارے میں صرف اتنا سا پوچھا تھا —

"کون تھا وہ؟ ...."

لاجونتی نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا "جماں —" پھر وہ اپنی نگاہیں سندر لال کے چہرے پر جمائے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سندر لال ایک عجیب سی نظروں سے لاجونتی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ لاجونتی نے پھر آنکھیں نیچی کر لیں۔ اور سندر لال نے پوچھ لیا۔

"اچھا سلوک کرتا تھا وہ؟"

"ہاں"

"مارتا تو نہیں تھا —؟"

لاجونتی نے اپنا سر سندر لال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا "نہیں تو" .... اور پھر بولی "اس نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ اگرچہ وہ مارتا نہیں تھا پر مجھے اس سے زیادہ ڈر لگتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی تھے پھر بھی میں تم سے ڈرتی نہیں تھی ...... اب تو نہ مارو گے؟"

سندر لال کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسف سے کہا۔

"نہیں دیوی .... اب نہیں ماروں گا .... نہیں ماروں گا"

"دیوی" لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔

اور اس کے بعد لاجونتی سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی لیکن سندر لال نے کہا۔

"جانے دو بیتی باتیں! اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ قصور ہے ہمارے سماج کا جو تجھ ایسی دیویوں کو اپنے ہاں عزت اور احترام کی جگہ نہیں دیتا۔ وہ تمہاری ہانی نہیں کرتا۔ اپنی کرتا ہے۔

اور لاجونتی کی من کی من ہی میں رہی، وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور چپکی، دبکی پڑی رہی اور اپنے بدن کی طرف دیکھتی رہی جو کہ بٹوارہ کے بعد اب دیوی کا بدن ہو چکا تھا۔ لاجونتی کا نہ تھا۔ وہ خوش تھی۔ بہت خوش لیکن ایک ایسی عجیب خوشی میں سرشار جس میں ایک شک تھا اور ایک وسوسہ اور وہ لیٹی لیٹی اچانک بیٹھ جاتی جیسے انتہائی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہٹ پاکر ایکا ایکی اس آہٹ کی طرف متوجہ ہو جائے .....

اور آخر جب بہت سے دن بیت گئے تو خوشی کی جگہ شک نے لے لی اس لئے نہیں کہ سندر لال بابو نے پھر وہی پرانی بدسلوکی شروع کر دی تھی بلکہ اس لئے کہ وہ لاجو سے بہت اچھا سلوک کرنے لگا تھا۔ ایسا سلوک جس کی لاجو متوقع نہ تھی ..... وہ سندر لال کی وہی پرانی لاجو ہو جانا چاہتی تھی جو گاجر سے لڑ پڑتی اور مولی سے مان جاتی لیکن اب لڑائی کا سوال ہی نہ تھا سندر لال نے اسے یہ محسوس کرا دیا جیسے وہ ——— لاجونتی کانچ کی کوئی چیز ہے جو چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی ..... اور لاجو شیشے میں اپنے سراپا کی طرف دیکھتی اور آخر اس نتیجہ پر پہونچتی کہ وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے،

فہرست

۱	دیباچہ		۳
۲	چھوئی موئی	راجندر سنگھ بیدی	۵
۳	آسمانی تلوار	خواجہ احمد عباس	۲۳
۴	والد صاحب	سعادت حسن منٹو	۳۷
۵	نلی	ہنس راج رہبر	۴۹
۶	میرا دوست	کرشن چندر	۶۳
۷	دیوالی	سُدرشن	۷۳
۸	برونسی کا پھول اور بھینس	اوپندر ناتھ اشک	۹۷
۹	کٹھ پتلیاں	عزیز احمد	۱۱۵
۱۰	قصہ پہلے درویش کا	اے۔ حمید	۱۴۵
۱۱	ہائی پھاتاں	میرزا ادیب	۱۵۵

پرلاجو نہیں ہوسکتی۔ وہ بس گئی، پر اُجڑ گئی ..... سندر لال کے پاس
اس کے آنسو دیکھنے کے لئے آنکھیں تھیں اور نہ آہیں سننے کے لئے کان!..
..... محلہ لاشکور کا سب سے بڑا سدھارک خود بھی نہ جان سکا انسانی دل
کتنا نازک ہوتا ہے!

(نورنگ کراچی)

خواجہ احمد عباس

آسمانی تلوار

آؤ بیٹا آؤ! باہر بارش میں کیوں کھڑے ہو؟ اندر آجاؤ۔ نہیں تو سردی لگ کر بخار ہو جائے گا۔ جب تک پانی پڑ رہا ہے تم غریب بڑھیا کی جھونپڑی میں آرام کرو۔ پھر چلے جانا ..... بھگوان کی لیلا نیاری ہے بیٹا! جس بارش سے دھرتی میں زندگی پڑتی ہے۔ بیج کونپل بنتا ہے اور کونپل پودا بنتی ہے۔ وہی بارش سیلاب بن کر ہزاروں کی جان لے لیتی ہے۔ جب گنگا مائی بپھر جاتی ہے تو پورے پورے گاؤں بہا کر لے جاتی ہے۔ یہ سب ہمارے کرموں کا پھل ہے۔ اور کیا؟ جیسا بوؤ گے ویسا ہی گاٹو گے۔ ایسا تو ممکن نہیں کہ بیج تو ڈالو جوار کے اور فصل کاٹو دھان کی دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ بھگوان شو کی آنکھ سب دیکھتی رہتی ہے اور جب پاپ اور ظلم حد سے بڑھ جاتے ہیں تو وہ آنکھ ایک ہی نظر میں سب کو بھسم کر ڈالتی ہے۔

یوں تو بھگوان کے لاکھوں ہتھیار ہیں۔ ایک سے ایک انوکھے! اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔ جب کسی پر پڑتی ہے تو پتہ بھی نہیں چلتا اور اپنا کام کر جاتی ہے لیکن

سب سے زبردست ہتھیار بھگوان نے اندر دیوتا کو سونپ رکھا ہے، اور ہونا بھی یہی چاہیئے۔ سارے دیوی دیوتاؤں کے وہ راجہ ٹھہرے۔ دیو لوک میں ان کا ہی تو حکم چلتا ہے۔ سچائی کی فوج کو لے کر راکھشسوں سے بھی انھیں ہی تو لڑنا ہوتا ہے تو ایسے خطرناک دشمنوں کا سامنا کرنے کے لئے ہتھیار بھی خطرناک ہونا چاہیئے۔

یہ بجلی جو تم بادلوں میں چمکتے ہوئے دیکھتے ہو بیٹا! یہی اندر دیوتا کی دودھاری تلوار ہے۔ اس کی چمک اور کڑک بڑے بڑوں کا دل دہلا دیتی ہے۔ پلک جھپکتے میں اپنا کام کر کے پھر آسمان پر اندر دیوتا کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ جبھی تو بادلوں کی گرج سنتے ہی پاپی کانپنے لگتے ہیں۔ اندر دیوتا کی یہ تلوار لوہے فولاد کی بنی ہوئی نہیں بیٹا! لوہے کی تلوار کو تو زنگ بھی لگ جاتا ہے۔ دھاری بھی کھنڈی ہو جاتی ہے۔ ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ لیکن یہ نرالا ہتھیار تو ایک انوکھی ہی دھات کا بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بڑے پہنچے ہوئے رشی نے بھگوان کی اتنی بھگتی اور تپسیا کی کہ ان کے جسم کا سارا گوشت جھڑ گیا۔ بس سوکھی ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا۔ ان متبرک ہڈیوں سے جو ہیرے کی طرح سخت اور تیز اور چمکیلی تھیں، بھگوان نے ایک تلوار بنائی اور وہ اندر دیوتا کو سونپ دی کہ جہاں کہیں پاپ اور ظلم کو بڑھتا ہوا دیکھیں۔ اس آسمانی تلوار سے اس کو ختم کر دیں۔

یہ تو تم نے سنا ہی ہوگا بیٹا! کہ بجلی کالے سانپ پر گرتی ہے۔ بھلا کیوں؟ اس لئے کہ زہریلے ناگ پچھلے جنم میں پاپی اور ظالم تھے۔ جنھوں نے دوسروں کو ڈس کر دکھ پہونچایا اور دنیا میں زہر پھیلایا۔ اسی کی تو یہ سزا ہے کہ اس بار بھگوان نے انھیں سانپ کے روپ میں پیدا کیا۔ لیکن بجلی صرف سانپوں پر ہی نہیں، بے ایمان، گندے اور زہر بھرے انسانوں پر بھی گرتی ہے۔ بھگوان شو کی آنکھ اُجلے کپڑوں،

اونچی پگڈنڈیوں اور میری ٹھاٹ باٹ سے دھوکہ نہیں کھاتی۔ وہ دل کے اندر کی ساری میل اور کھوٹ کو دیکھ سکتی ہے اور جب اندر دیوتا کی تلوار کا وار پڑتا ہے تو وہ اونچے اونچے درختوں کی چھاتی چیرتی ہوئی پاپیوں کی گردن تک جا پہنچتی ہے۔

تم لوگ پڑھے لکھے ہو بیٹا! ایک پاگل بڑھیا کی بات کیوں مانو گے لیکن میں بھگوان کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ جو کچھ کہہ رہی ہوں سب سچ ہے۔ یہ تو اب یاد نہیں کہ کتنے برس کی بات ہے شاید بیس پچیس تیس برس ہوئے ہوں گے۔ اب بھی بہتیرے لوگ اس گاؤں میں ہوں گے جنھیں یہ بات یاد ہوگی اور اگر اپنی آنکھوں دیکھا ثبوت چاہتے ہو تو تالاب کے پرے کھیتوں کے بیچ میں جو نیم کے پیڑ کا ٹھنٹھ کھڑا ہے جا کر اسے دیکھ لو۔ کسی زمانے میں یہ اتنا بڑا اور گھنا پیڑ تھا کہ بیس آدمی بھی نیچے کھڑے ہو جائیں تو ان پر ایک بوند بارش کی نہ گرے۔ لیکن اس دن سے آج تک اس کی ٹہنیوں میں کبھی ہریالی نہیں آئی۔ یوں ہی جلا بھنا کھڑا ہے اور آسمان کی طرف انگلی اٹھائے اس دن کی یاد دلا رہا ہے .....

وہ بارش مجھے آج تک یاد ہے۔ اس برس سے بھی کہیں زیادہ پانی برسا تھا۔ یہ کچی سڑک جو آگرہ والی پکی سڑک سے ہمارے گاؤں تک آتی ہے پوری پانی میں ڈوب گئی تھی اور آنے جانے والے کھیتوں کھیتوں پگڈنڈیوں پر سے آتے جاتے تھے۔ ہم اچھوتوں کی جو یہ بستی گاؤں کے باہر ہے۔ یہاں کتنے ہی چھونپڑوں کی کچی اینٹوں کی دیوار گر پڑی تھی۔ ایک ننھا سا بیس بائیس دن کا بچہ بھی مر گیا تھا .....

مجھ بڑھیا کو معاف کرنا بیٹا! میری آنکھیں دکھتی ہیں تو پانی نکلتا ہی رہتا ہے ہاں تو اس برسات میں ایک دن کی بات ہے کہ رات بھر کی موسلا دھار بارش کے بعد صبح سویرے پانی ذرا رکا تو بہت سے گاؤں والے جو کئی دن سے اپنے

گھروں میں بند بیکار بیٹھے تھے کام کاج کو نکل پڑے۔ کوئی کھیتوں میں نلائی کرنے نکل گیا۔ کسی کو پاس کے قصبے میں کوئی کام یاد آگیا۔ سوموار کا دن تھا۔ شاید اس دن سامنے والے گاؤں راجہ پور میں بازار لگتا تھا۔ کئی ایک وہاں چلے گئے۔ مگر آسمان پہ بادل تب بھی چھائے ہوئے تھے۔ بارش کا کوئی ٹھکانا نہیں بیٹا، کون جانے کب پھر جھڑی لگ جائے۔ اور ہوا بھی یہی۔ دو چار گھنٹے تو کھلا رہا۔ پھر وہ گھٹا ٹوپ چھایا کہ دن میں رات جیسا اندھیرا ہو گیا۔ ساتھ میں گھڑی گھڑی بجلی ایسی چمکنے لگی جیسے اندھیرے میں کوئی تلوار چلا رہا ہو۔ پھر ایک دم موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بالکل ایسی جیسے آج ہو رہی ہے۔

گاؤں کے کتے ہی آدمی باہر نکلے ہوئے تھے۔ جو کہیں پاس ہی تھے وہ تو بھیگتے بھاگتے گاؤں کی طرف بھاگے۔ جو دوسرے گاؤں گئے ہوئے تھے وہ وہیں رک گئے۔ لیکن چار آدمی ایسے تھے جو نکلے تو تھے الگ الگ مگر ایک ایک کر کے اسی نیم کے نیچے پہونچ گئے۔ یا یوں کہوں کہ ان کی قسمت انھیں وہاں کھینچ کر لے آئی .....

ان چاروں میں سے تم نے کسی کو تو کیا دیکھا ہوگا۔ بیٹا! ان دنوں تو تم شاید پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ پھر بھی شاید ان میں سے ایک کا نام تو سنا ہوگا۔ یہ جو آج کل ہمارے زمیندار ہیں نا! ان کا بڑا بھائی ٹھاکر ہرنام سنگھ۔ بڑا تگڑا اور رنگیلا نوجوان تھا۔ یہ چوڑی چھاتی، بڑی بڑی بارعب مونچھیں۔ شادی نہیں ہوئی تھی آس پاس کے ٹھاکروں کی کتنی ہی بیٹیاں اس کے نام پر کنواری بیٹھی تھیں۔ گاؤں میں کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر نکل جاتا تو لڑکیاں اسے کیواڑوں کے پیچھے چھپ کر جھانکتیں۔ زبان کا بھی بڑا میٹھا تھا۔ بولتا تھا ایسا کہ سننے والے پر بس جادو ہی ہو جائے .....

آج نہ جانے میری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے بیٹا! بہے ہی جا رہی ہیں ....

ہاں تو وہ تھا زمیندار کا بیٹا، مگر پرجا سے ہمیشہ میٹھا ہی بولتا تھا۔ انعام واکرام بھی بہت دیتا تھا۔ گاؤں بھر میں سب اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ کہتے کہ زمیندار ہو تو ہرنام سنگھ جیسا ہو۔ شکار کا بہت شوق تھا اُسے۔ اس دن بھی گھوڑے پر سوار ہو کر مرغابیوں کے شکار کو نکلا تھا لیکن جھیل تک پہونچا نہیں تھا کہ بادلوں کی کڑک سے گھوڑا ایسا بدکا کہ بھاگتا بھاگتا دلدل میں جا گرا۔ ٹھاکر مرتے مرتے بچا۔ مگر گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ بے زبان جانور کو درد سے چلاتے دیکھا تو ٹھاکر سے نہ رہا گیا اور اُسے گولی مار دی۔ میں نے کہا نا کہ وہ تھا بڑا دردل اِدھر سے پیدل اپنی کوٹھی کو واپس جا رہا تھا کہ ایک دم زور کی بارش آگئی اور بھاگ کر نیم کے پیڑ کے نیچے پناہ لینا پڑی۔ جہاں اس کے تین جاننے والے پہلے ہی سے وہاں کھڑے تھے۔

ان میں سے ایک تو پنڈت دھرم داس تھا۔ دُبلا پتلا سوکھا سا برہمن۔ گلے میں جنیؤ، ماتھے پر بڑا چندن کا ٹیکا۔ سارے گاؤں میں وہی سب سے زیادہ پڑھا لکھا عقلمند شخص تھا۔ کہتے تھے اُسے سارے وید شاستر زبانی یاد تھے۔ ہر وقت اسے دھرم اور سماج کی رکشا ہی کی فکر رہتی تھی۔ یہ اسی کا دم تھا کہ ہمارے گاؤں میں اِدھر کی اور ناستک خیالات کبھی نہ پھیلے۔ ایک بار کہیں سے ایک سدھارک آگیا اور کہنے لگا کہ ہندوؤں کو ذات پات چھوڑ کر اچھوتوں کو اپنا بھائی سمجھنا چاہیئے لیکن دھرم داس نے ناستک اور ادھرمی کہکر اُسے فوراً گاؤں سے نکلوا دیا۔ دھرم داس خود تو غیر شادی شدہ تھا لیکن اسے گاؤں کی عزت و آبرو کا بہت خیال رہتا تھا۔ گاؤں کے کسی لڑکے یا لڑکی کو کبھی ایسی ویسی بات کرتے دیکھ لیتا تو آگ بگولا ہو جاتا اور پنچایت سے ایسی کڑی سزا دلواتا کہ پھر کسی کی ہمت نہ

ہوتی کہ وہ پاپ کے راستے پر قدم بھی رکھ سکے۔ ہاں ایک لڑکی تھی مولو رام سُنار کی ابھاگن بیٹی چندا۔ وہ نہ جانے کیسے پاپ کے گڑھے میں گر پڑی۔ اس کلنکنی نے بن بیاہی ہو کر بچہ جنا تھا۔ ماں باپ نے اُسے کتنا ہی پیٹا اور پنچوں نے کتنا ہی سمجھایا، دھمکایا لیکن اس نے یہ نہ بتایا کہ بچے کا باپ کون ہے۔ یہی کہتی رہی کہ میں نے پاپ کیا ہے جو سزا دینا ہے مجھے دیدو۔ اس لئے پنڈت دھرم داس کے کہنے پر چندا کو اس کے باپ کی نشانی سمیت گاؤں سے باہر نکال دیا گیا۔ پھر گاؤں والوں نے سُنا کہ اسے گاؤں کے باہر اچھوتوں کی بستی میں پناہ مل گئی ہے اور یہ سُنکر پنڈت جی نے کہا کہ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے کیونکہ بھگوان کی نظروں میں پاپی اور اچھوت برابر ہی ہیں۔

دوسرا وہاں پیڑ کے نیچے، ساہوکار مولچند تھا جو رہتا تو تھا راجپور میں لیکن جس سے لین دین ہمارے گاؤں والوں کا بھی بہت چلتا رہتا تھا۔ جب بھی ضرورت پڑے اس کے پاس چلے جاؤ۔ روپے کا انتظام کر ہی دیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بیاج کڑا لیتا تھا۔ اور پہلے برس کا بیاج تو رقم میں سے پہلے ہی نکال لیتا تھا۔ لیکن سب کہتے یہ تو ساہوکاری کا اصول ہے، اس کا کیا رونا۔ مولچند بات تو بڑی حلیمی سے کرتا ہے اور آڑے وقت میں کام بھی آتا ہے۔ . . . . . .

وہ دین دھرم کے کاموں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ کتھا ہو، پوجا ہو، پاٹھ ہو، کیرتن ہو، ہون ہو۔ ہر بات میں سب سے بڑی رقم چندہ کی اس سے ملتی تھی۔ دان دھرم کا اسے بہت خیال رہتا تھا۔ مولو رام سُنار کی بیٹی چندا کو جب گاؤں والوں نے نکال دیا تو مولچند مہاجن نے پنڈت جی کو بہت شاباش دی اور کہا "پنڈت جی تم نے تو پھر نرمی برتی۔ ہمارے گاؤں کی کوئی چھوکری ایسا کرتی تو ٹانگیں توڑ دیتے ہم اس کی ٹانگیں"۔ ایک اور بات مولچند کی یہ تھی کہ وہ

کپڑے ہمیشہ بڑے اُجلے پہنتا تھا۔ جیسے ابھی دھوبی کے گھر سے دُھل کر آئے ہوں۔ مہین ململ کا بیل لگا ہوا کرتہ، آستینوں پر چنت پڑی ہوئی اور سفید چنّی دھوتی عطر بھی بہت لگاتا تھا۔ دُور ہی سے پتہ چل جاتا کہ مہاجن آرہا ہے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے کہ اس کا پسینہ بڑا بدبودار ہے۔ اسی لئے اتنا سارا عطر لگاتا تھا۔ ایک دن کسی نے اس سے کہا "مہاجن یہ تمہارے کپڑے ہر وقت اتنے اُجلے کس طرح رہتے ہیں؟ دن میں دو تین بار بدلتے ہوگے؟" اس پر وہ ہنس کر بولا "یہ دھوبی کی دھلائی کی بات نہیں ہے بھیّا۔ یہ من کی صفائی ہے۔ اور تم جانو من اُجلا سو تن اُجلا۔ تن اُجلا سو من اُجلا۔"

تیسرا وہاں رحمت خاں پٹواری تھا بیٹا! اب تو پٹواریوں نمبردار وں کی وہ پرانی بات رہی نہیں لیکن ان دنوں تو یوں سمجھو کہ رحمت خاں ہمارے گاؤں کا بادشاہ جارج پنجم، بڑا لاٹ۔ چھوٹا لاٹ اور کلکٹر صاحب، سب ہی کچھ تھا۔ زمینوں کا ناپنا، داخل خارج، سب کام اسی کے ہاتھ سے ہوتے تھے۔ گاؤں والے ٹھہرے اَن پڑھ، جیسے ساہوکار کے کہنے پر اس کے کاغذ پر انگوٹھا لگا دیتے تھے ویسے ہی پٹواری کے کہنے سے سٹاموں اور سرکاری کاغذوں پر انگوٹھا لگا دیتے تھے۔ زمینوں کے بارے میں جو کام بھی ہوتا وہ رحمت خاں خوشی سے کر دیتا اور کام ہو جانے پر وہ بھی اسے خوش کر دیتے تھے۔ اب چاہے اسے رشوت سمجھ لو یا کچھ اور سمجھ لو۔ لیکن ویسے بڑا شاندار آدمی تھا۔ یہ لمبی داڑھی تھی۔ روزے نماز کا بڑا پابند تھا۔ گاؤں کی مسجد میں پانچوں وقت حاضری دیتا تھا۔ ایک بار حج بھی کر آیا تھا اور اس سال پھر حج جانے کی بات کر رہا تھا اور اسی لئے اُسے خوش کرنے کے لئے اب کسانوں کو ذرا زیادہ رقم دینی پڑتی تھی۔ دو بیویاں تھیں اور دونوں سے وہ بڑا کڑا پردہ کرواتا تھا۔ خاص کر

چھوٹی سے جو مشکل سے بیس بائیس برس کی ہوگی اور عمر میں اس کی بیٹی معلوم ہوتی تھی۔ ذات کا پٹھان تھا اس لئے دماغ ذرا گرم تھا۔ ویسے بھی تگڑا تو تھا ہی۔ ایک دن تاؤ میں آکر نور بخش جولاہے کے تھپڑ مار دیا تھا کیونکہ اس نے اچھی طرح خوش نہیں کیا تھا۔ تو وہ تین دن کھاٹ پر پڑا رہا۔ ایسے ہی ایک دن چھدو چمار پر غصہ آگیا تو اسے زمین پر دے مارا۔ لیکن ایسا غصہ وہ نیچ ذات والوں کے ساتھ ہی برتتا تھا۔ زمیندار صاحب سے، پنڈت جی سے، ساہوکار سے وہ بڑے ادب سے بات کرتا تھا۔ اور گاؤں میں تحصیلدار۔ نائب تحصیلدار تھانے دار یا کوئی دوسرا افسر دورے پر آنکلتا تو ان کے خیر مقدم میں وہ اتنی دوڑ دھوپ کرتا تھا کہ سب کہتے "اپنا پٹواری ہے بڑا دل والا اور اس کی پہونچ بھی دیکھو کتنے بڑے بڑے افسروں تک ہے ....."

ہاں تو یہ چاروں پیڑ تلے کھڑے بھگوان سے پرارتھنا کر رہے تھے کہ بارش رک جائے۔ اس دن گرج چمک بھی بہت زوروں پر تھی۔ ایک بار بجلی زور سے چمکی تو وہ کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے پگڈنڈی پر رلدو چمار اور وہ سُنار کی لونڈیا چندا جسے انھوں نے گاؤں سے نکالا دے رکھا تھا۔ دونوں پانی میں شرابور اس پیڑ کی طرف چلے آرہے ہیں۔

ہاں بیٹا! یہ بتانا تو میں بھول ہی گئی تھی کہ بوڑھا رلدو چمار تھا تو ذات کا اچھوت لیکن چونکہ گاؤں والے اُسی سے جوتے بنواتے تھے اس لئے گاؤں کے سارے بچے اُسے رلدو کاکا رلدو کاکا کہتے تھے۔ جس دن چندا کو گاؤں سے نکالا گیا وہ اچھوتوں کی بستی میں سے اپنے بچے کو لئے روتی ہوئی جا رہی تھی۔ رلدو نے دیکھا تو کہا "بیٹی اس حالت میں تو کہاں جائے گی جب تک تیرے باپ کا غصہ ٹھنڈا ہو، تو میرے ہاں ٹھہر جا" اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اور

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ سو چندا رلدو کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں رہنے لگی۔ اس کے باپ نے جب یہ سُنا تو اس نے بھی کہا: "چلو اچھا ہی ہوا۔ رلدو ہے تو چمار لیکن اپنی جان پہچان والا ہے اور ویسے آدمی بھی اچھا ہے۔ اِدھر اُدھر مارے پھرنے سے تو یہی اچھا ہے کہ چندا اسی کے ہاں رہے۔" لیکن بہت سے اونچی ذات والے ایسے بھی تھے جو کہنے لگے کہ اچھوت کے ہاں رہنے سے تو اچھا تھا کہ چندا بھیل میں ڈوب کر جان دے دیتی اور اگر بگڑے دل نوجوانوں کا بس چلتا تو وہ رلدو کا جھونپڑا جلا کر راکھ کر ڈالتے۔ وہ تو بڑے بوڑھوں نے انھیں روک لیا اور پھر بارش بھی اتنے زور سے ہو رہی تھی کہ کسی کا باہر نکلنا بھی محال تھا۔ جب آسمان پھاڑ کر اتنا پانی برس رہا ہو تو آگ کہاں لگ سکتی ہے؟

میں نے کہا نا: بیٹا، یہ سب بھگوان کی لیلا ہے۔ بارش نے رلدو چمار کے جھونپڑے کو جلنے سے تو بچا لیا لیکن اسی بارش نے اس کی کچی اینٹوں کی دیواروں کو ڈھا دیا۔ اس وقت رلدو تو اپنی دوکان میں بیٹھا جوتے بنا رہا تھا اور چندا کے بچے کو سردی لگ کر بخار آ رہا تھا اس لئے وہ پڑوس کی چمارن کے ہاں کوئی دوا مانگنے گئی ہوئی تھی۔ جھونپڑے میں بس اس کا بچہ ہی تنہا تھا۔ اتنے میں اڑا اڑا دھم، پچھواڑے کی دیوار ڈھ کر چھپر نیچے آ رہا۔ رلدو اور چندا دونوں بھاگے آئے۔ مگر اس وقت تک بچہ مر چکا تھا۔ نامراد ننھی سی جان۔ اس نے ایک چیخ بھی تو نہ ماری۔ بس چپکے سے جان دے دی، بیٹا! میں سوچتی ہوں، چندا کا بچہ اس دن مرا نہ ہوتا تو آج تمہاری عمر کا ہوتا . . . . . .

اپنے مردہ بچے کو دیکھ کر چندا کی آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ نکلا۔ ایسی

راجندر سنگھ بیدی

چھوئی موئی

بٹوارہ ہوا، اور بے شمار زخمی لوگوں نے اُٹھ کر اپنے بدن پر سے خون پونچھ ڈالا، اور پھر سب مل کر ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جن کے بدن صحیح سالم تھے لیکن ان کے دل زخمی تھے۔

گلی گلی، محلے محلے میں "پھر بساؤ" کمیٹیاں بن گئی تھیں اور شروع شروع میں بڑی تندہی کے ساتھ "کاروبار میں بساؤ" "زمین پر بساؤ" اور "گھروں میں بساؤ" پروگرام شروع کر دیا گیا تھا۔ لیکن ایک پروگرام ایسا تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہ کی تھی۔ وہ پروگرام مغویہ عورتوں کے سلسلے میں تھا۔ جس کا سلوگن تھا "دل میں بساؤ" اور اس پروگرام کی نارائن باوا کے مندر اور اس کے آس پاس بسنے والے قدامت پسند طبقے کی طرف سے بڑی مخالفت ہوتی تھی۔

اس پروگرام کو حرکت میں لانے کے لئے مندر کے پاس محلہ لاشکور میں ایک کمیٹی قائم ہو گئی اور گیارہ ووٹوں کی اکثریت سے سندر لال بابو کو اس کا سکریٹری چن لیا گیا اور

ہو گئی جیسے پتّھر کی بنی ہوئی ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُس نے اپنے بچے کے مرنے پر رو کر دل کی بھڑاس نہیں نکالی۔ اس لئے اس کا دماغ پھر گیا اور وہ پاگل ہو گئی۔

نہ جانے آج میری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے بیٹا، پانی تھمے اور تم سے ہو سکے تو بازار میں ویدجی کی جو دوکان ہے وہاں سے دوا لا دینا...

میں بھی کہاں سے کہاں بہک جاتی ہوں۔ ہاں تو رلدو چمار اور کلنکنی چندا کو اُس پیڑ کی طرف آتے دیکھ کر ان چاروں کا ماتھا ٹھنکا۔

پنڈت دھرم داس نے چلا کر کہا —— "رلدو، کہاں منہ اُٹھائے چلا آ رہا ہے۔ وہیں ٹھہر۔"

رلدو ٹھٹھکا، پھر دُور سے ہاتھ جوڑ کر اس نے کہا: "پنڈت جی، دیا کرو۔ طوفان بڑا بھیانک ہے۔ ہم دونوں ایک طرف کھڑے ہو جائینگے۔"

یہ کہہ کر رلدو آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ دھرم داس نے پھر للکارا: "بس، بس، ایک ذرا سا پیڑ ہی تو ہے، یہاں کون سا محل کھڑا ہے جو ایک کونے میں تم بھی کھڑے ہو جاؤ گے؟"

اور پھر اس نے ٹھاکر ہرنام سنگھ سے کہا: "ٹھاکر صاحب! انھیں یہاں نہ آنے دینا چاہیئے؟ نہیں تو ہم سب مارے جائیں گے۔"

اس پر پٹواری رحمت علی خاں بولا: "کیوں پنڈت جی، کیا خطرہ ہے؟"

پنڈت بولا: "تم نہیں جانتے خاں صاحب! دھرم ساشتروں میں لکھا ہے کہ بجلی پاپی اور اپوتر لوگوں پر گرتی ہے۔ ان میں ایک اچھوت ہے۔ دوسری کلنکنی۔ اگر یہ یہاں آ گئے تو سمجھ لو ساتھ ہی ہماری بھی موت آ گئی۔"

پٹواری بولا "جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو ..... پنڈت جی ایسا ہے تو انھیں پاس بھی نہ پھٹکنے دینا چاہیئے"

"ہاں اور کیا" مہاجن جلدی سے بولا "جان تھوڑے ہی دینا ہے ان کیلئے"

چندا جو ٹکٹکی باندھے پاگلوں کی طرح ٹھاکر ہرنام سنگھ کو گھورے جا رہی تھی اب مارے سردی کے کانپنے لگی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر رلدو نے ایک بار پھر منت کی "سرکار، لونڈیا کو کپکپی چھوٹ رہی ہے۔ نمونیا ہو کر مر جائے گی۔ اس کا بچہ تو پہلے ہی جھونپڑے کی دیوار کے نیچے دب کر مر چکا ہے۔

چندا اب بھی ٹھاکر کو گھورے ہی جا رہی تھی۔ مگر اُس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور اپنی بندوق کھولکر اس کی نال جھانکنے لگا جیسے اس بات چیت سے اُسے کوئی سروکار نہ ہو۔ اور بیٹا تھا بھی ٹھیک، وہ ٹھہرا زمیندار، اسے ان نیچ لوگوں کے مرنے جینے سے کیا؟"

چندا کے بچے کے مرنے کا سُن کر دھرم داس نے کہا "چلو اچھا ہوا، پاپ کی نشانی ختم ہوئی"

رلدو بولا "ہاں پنڈت جی، جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ میں تو اسی لئے چندا کو اس کے باپ کے پاس لے جا رہا تھا کہ جس وجہ سے اس بیچاری کو گھر سے نکالا تھا وہ بچہ ہی نہیں رہا تو اب تو پرائشچت کرا کے اسے گھر میں رکھ لیں"

لیکن مہاجن نے ہمیشہ کی طرح اب بھی اپنی میٹھی زبان سے کام نکالنا چاہا کہنے لگا "وہ سب بعد میں دیکھا جائے گا، رلدو، مگر اب تم جاؤ، کوئی اور پیڑ تلاش کرو۔ اس پیڑ کے نیچے اب کوئی جگہ نہیں ہے"

رلدو نے کہا "سا ہوکار جی، تم تو جانو ہو، یہاں دُور دُور کوئی دوسرا پیڑ نہیں ہے"

اور مہاجن نے سمجھانے کے لئے کہا: "ذرا سوچ سمجھ کر بات کر۔ دھرم شاستر کے لکھے کا تو خیال کر۔ تم دونوں پر بجلی گرنے کا ڈر ہے۔ اپنے ساتھ کیوں ہمارا بھی خون گراتے ہو؟ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں ہے مگر دیکھو تو ٹھاکر صاحب ہیں، یہاں کے پنڈت جی ہیں، پٹواری جی ہیں۔ . . . . . .

اتنے میں وہ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ابھاگن چندا سردی سے کانپتی کھیجڑ میں پھسلتی ان کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے اور اس کے پیچھے رلدو "چندا بیٹی کیا کر رہی ہے؟ چندا بیٹی کیا کر رہی ہے؟" کہتا ہوا۔ اور اسی وقت ان کے سامنے کے بادلوں میں بجلی زور سے چمکی اور اتنے زور کا دھماکہ ہوا کہ زمین کانپ اٹھی۔

پنڈت زور سے چلایا: "ٹھاکر صاحب! بندوق سنبھالئے نہیں تو غضب ہو جائے گا۔ ہم سب مر جائیں گے۔"

ٹھاکر نے بندوق اٹھا کر کندھے سے لگائی۔ لیکن اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اپنی طرف بندوق کا منہ دیکھ کر چندا تو جیسے بالکل ہی پاگل ہو گئی پلائی۔ تم تو مجھے پہلے ہی مار چکے ہو ٹھاکر! اب بندوق چلانا چاہتے ہو تو یہ شوق بھی پورا کر لو۔ میں بھی اپنے بچے کے پاس چلی جاؤں گی۔" اور پھر مری ہوئی آواز میں اس نے کہا: "تمہارے بچے کے پاس۔"

اس کی یہ عجیب باتیں سن کر سب کو پکا یقین ہو گیا کہ وہ پاگل ہو گئی ہے دو۔ دلوں میں ایک بار پھر گڑگڑاہٹ ہو رہی تھی۔ جیسے بجلی گرنے کی تیاری ہو۔ چندا کو ایک قدم اور بڑھتے دیکھ کر مہاجن چلایا: "سرکار کیا دیکھتے ہیں؟ چلایئے گولی نہیں تو یہ پگلی اپنے ساتھ ہمیں بھی لے مرے گی۔"

لیکن بیٹا! ٹھاکر کی بندوق نہیں چلی۔ اس سے پہلے بھگوان کی تلوار چل گئی۔ ابھی وہ بندوق کا گھوڑا دبانے والا ہی تھا کہ ایسی بھیانک چمک ہوئی جیسے

سورج دیوتا دھرتی پر آ گئے ہوں۔ رلدو اور چندا نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک دھماکہ ہوا اتنے زور کا دھماکہ، بیٹا جیسے سینکڑوں توپیں ایک دم چلی ہوں۔ دھرتی کانپ اٹھی اور رلدو اور چندا زمین پر آ رہے اور انھیں یقین ہو گیا کہ بجلی ان پر گری ہے . . . . . .

مگر بیٹا جسے بھگوان رکھے اُسے کون چکھے۔ جب انھوں نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ وہ نیم کا پیڑ چوٹی سے لے کر جڑ تک جلا ہوا ہے اور اس کے نیچے چار لاشیں جھلسی پڑی ہیں۔ ٹھاکر کی بندوق اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی لیکن اس کی نال پر بجلی گری تھی اور وہ گل کر اس طرح تڑ مڑ گئی تھی جیسے موم کی بنی ہو . . . . . .

ہاں بیٹا، میں کہتی ہوں اندر دیوتا کی آسمانی تلوار کا ہم انسانوں کی تلواریں، بندوقیں بھلا کیا مقابلہ کر سکتی ہیں؟ یہ سب ہمارے کرموں کا پھل ہے اور کیا؟ جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ بیج تو ڈالو جوار کے اور فصل کاٹو دھان کی۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے بھگوان شو کی آنکھ وہ سب دیکھتی رہتی ہے۔ وہ اُجلے کپڑوں، اونچی پگڑیوں یا میری ٹھاٹ باٹ سے دھوکہ نہیں کھا سکتی۔ دل کے اندر کی ساری میل اور سارے کھوٹ کو دیکھ سکتی ہے اور اس لئے جب اندر دیوتا کی تلوار کا وار پڑتا ہے تو وہ اونچے اونچے درختوں کی چھاتی چیرتی ہوئی پاپیوں کی گردن تک جا پہونچتی ہے . . . . . میں نے جو کچھ کہا ہے تم اُسے ایک پگلی پڑھیا کی بڑ سمجھ رہے ہو نا بیٹا، تم سوچتے ہو کہ جب وہ سب وہیں کے وہیں مر گئے تو پھر مجھے یہ سب حال کیسے معلوم ہوا؟ لیکن میں نے جو کچھ کہا وہ جھوٹ نہیں ہے بیٹا . . . . . .

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

لو، بارش بھی کم ہوگئی، اب باہر جاؤ تو بازار میں وحید جی کی دوکان پر ہوتے جاتا۔ ان سے کہنا آج میری آنکھ سے پھر پانی بہہ رہا ہے۔ کوئی دوا دیدیں۔ کہنا تمہیں پگلی چندا نے بھیجا ہے۔ . . . . . .

لیکن تم تو پہلے ہی چلے گئے، میری اوٹ پٹانگ باتوں سے کترا کر، اور آخر تم نے بھی میری کہانی نہیں سنی۔ کوئی میری کہانی نہیں سنتا۔ میں پگلی جو ہوں . . . . . بارش تھمنے تک تو ٹھہر جاتے، بیٹا!

(شاہراہ)

سعادت حسن منٹو

والد صاحب

توفیق جب شام کو کلب میں آیا تو پریشان سا تھا۔

دو ربر ہارنے کے بعد اس نے جمیل سے کہا۔ "بھئی میں چلا"

جمیل نے توفیق کے گورے چٹے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور کہا۔

"اتنی جلدی؟"

ریاض نے تاش کی گڈی کے دو حصے کر کے انھیں بڑے ماہرانہ انداز میں پھینٹنا شروع کیا۔ اس کی نگاہیں تاش کے پھڑپھڑاتے پتوں پر تھیں لیکن روئے سخن توفیق کی طرف تھا۔ "توفی، آج تم پریشان ہو۔ خلاف معمول اوپر تلے دو ربر ہارے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج شام کو ہسپتال میں نرس مارگریٹ نے تمہارے رومانس کو پوٹاشیم برومائڈ پلا دیا۔"

جمیل نے ایک بار پھر غور سے توفیق کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ "کیوں توفی آج ٹمپریچر کیسا رہا؟"

نصیر اپنی کرسی پر سے اٹھا۔ توفیق کی انگلیوں میں پھنسا ہوا سگریٹ نکالا اور زور کا کش لے کر کہنے لگا "سب بکواس ہے۔ توفی نے اب تک جتنے رومانس لڑائے ہیں سب بکواس تھے۔ یہ نرس مارگرٹ کا قصہ تو بالکل من گھڑت ہے۔ مری کی ٹھنڈی ہواؤں سے یہاں لاہور کی گرمیوں میں آنے کے باعث اسے سرسام ہو گیا ہے۔"

توفیق اُٹھ کھڑا ہوا۔ "بکو نہیں۔"

نصیر ہنسا۔ "اگر نہیں ہوا تو آج کل میں ہو جائے گا۔ بتاؤ تمہارے ابا کب تک ہسپتال میں رہیں گے۔" یہ کہہ کر وہ توفیق کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

توفیق نے اپنے کلف لگے ہوئے ململ کے کرتے کی ڈھیلی آستینوں کو اوپر چڑھایا اور جمیل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "چلو، چلیں۔ میری طبیعت یہاں گھبرا رہی ہے۔"

جمیل اٹھا۔ "بھائی توفی تم کوئی بات چھپا رہے ہو۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔"

"گڑبڑ وڑبڑ تو کچھ نہیں۔ نصیر کی بکواس سے کون ہے جس کی طبیعت نہیں گھبراتی۔" توفیق نے جیب سے باجہ نکالا اور منہ کے ساتھ لگا کر بجانا شروع کیا۔

نصیر نے اپنی ٹانگیں میز پر پھیلا دیں اور زور زور سے کہا۔ "بکواس ہے سب بکواس ہے۔ یہ دُھن جو تم بجا رہے ہو، رشید عطرے کی ہے۔ اور رشید عطرے کی کوئی دُھن سُن کر آج تک کوئی اینگلو انڈین یا انڈین کرسچین نرس بے ہوش نہیں ہوئی۔ بہتر ہو گا اگر تم رومال پر تھوڑا سا کلوروفارم چھڑک کر لے جاؤ۔"

ریاض نے تاش کی گڈی رکھدی اور نصیر کی ٹانگیں ایک طرف ریل دیں۔ "کچھ بھی ہو لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ توفی میاں اپنی گاڑی کا ہارن بجائے

تو لڑکیاں سن کر اس پہ فریفتہ ہو جاتی ہیں۔"

نصیر نے سگریٹ کی گردن ایش ٹرے میں دبائی "اور سائیکل کی گھنٹی بجائے تو آسمان پر سے فرشتے اُترنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ اس کی کھانسی کی آواز سُن کر باغ جناں کی ساری بلبلیں اپنی نغمہ سرائی بھول گئی تھیں۔ بڑا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ ماسٹر غلام حیدر نے پورا ایک مہینہ ان کو ریہرسل کرائی تب جا کر وہ کچھ ٹوں ٹاں کرنے لگیں۔"

توفیق کے سوا باقی سب ہنسنے لگے۔ نصیر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ اُٹھ کر توفیق کے پاس گیا۔ اس کے کلف لگے ململ کے کرتے کی ایک شکن درست کی اور کہا "مذاق برطرف۔ لو اب بتاؤ ہسپتال کی لونڈیا سے تمہارا معاملہ کہاں تک پہونچا؟ میں تو سمجھتا ہوں وہیں کا وہیں ہو گا ایک شریف آدمی اپنڈے سائیٹس کا آپریشن کرائے پڑا ہے۔ مقررہ اوقات پر یہ تمہاری نرس صاحبہ تشریف لاتی ہیں۔ جناب صرف ایک دفعہ صبح اور ایک دفعہ شام وہاں جا سکتے ہیں۔ مریض اور وہ بھی قبلہ والد صاحب۔ وہ مریض اپنڈے سائٹس اور تم مریضِ عشق"——

ریاض نے قریب آ کر کہا "مریضِ عشق پہ رحمت خدا کی"!

نصیر کی رگِ مذاق پھڑک اٹھی "اور مریضِ عشق پر جب خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے تو وہ بینڈ ماسٹر بن جاتا ہے۔ آج تو فی منہ سے باجہ بجا۔ ہائے خدا کی رحمت شامل رہی تو کل سیکسوفون بجائے گا۔ آہستہ آہستہ اس کے ساتھ دوسرے مریضانِ عشق شامل ہوتے جائیں گے۔ پھر تو یہ براتوں کے ساتھ منہ میں کلارنٹ دبائے فلمی ٹیونیں بجایا کرے گا۔ ہیرا منڈی سے گزرتے ہوئے اس کی کلارنٹ کا منہ اونچا ہو جایا کرے گا۔ گال دھونکنی کی طرح پھولیں گے۔ گلے کی رگیں ابھر آئیں گی اور رنڈیاں کوٹھوں پر سے اس پر رحمت خداوندی کے پھول برسائیں گی۔"

توفیق تنگ آ گیا۔ ہاتھ جوڑ کر نصیر سے کہنے لگا "خدا کے لئے یہ بھانڈ پنا بند کرو۔"

نصیر نے جمیل کی طرف دیکھا "لو صاحب ہم بھانڈ ہو گئے۔ دنیا بھر کی نقلیں یہ اتاریں۔ زمانے بھر کی خرافات یہ بکیں اور بھانڈ ہم کہلائیں۔ یہ تو آج انھیں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے دیکھ کر میں نے چھیڑ خانی شروع کر دی کہ شاید اسی حیلے اُگلیں۔ منہ سے بولیں۔ سر سے کھلیں۔ ورنہ جائے استاد خالیست کجا رام رام کجا ٹیں ٹیں۔" یہ کہہ کر اس نے توفیق کے کلف لگے ململ کے کرتے کی شکن درست کی "بھئی توفیق ذرا چہکو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔"

توفیق نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا ایک سگریٹ سلگایا اور کش لگا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر سے تاش کی گڈی اٹھائی اور پیشنس کھیلنے لگا مگر نصیر نے لپک کر پتے اٹھا لئے "یہ بڈھے جرنیلوں کا کھیل ہے جو زندگی میں کئی بار اپنی تمام کشتیاں جلا چکے ہوں۔ تم اتنے مایوس کیوں ہو گئے ہو۔ مارگرٹ نہ سہی کوئی اور سہی۔" یہ کہہ وہ جمیل اور ریاض سے مخاطب ہوا "یارو مجھے بتاؤ یہ قتالہ کون ہے؟ خوبصورت ہے؟ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے؟ پانی پیتی ہے تو گردن میں سے دکھائی دیتا ہے؟"

جمیل توفیق کے پاس بیٹھ گیا "وہ فارسی کا محاورہ کیا ہے۔ لیلیٰ بنظرِ مجنوں باید دید۔ مارگرٹ بنظرِ تونی باید دید۔ کیوں تونی؟"

توفیق خاموش رہا۔

"میں پوچھتا ہوں، خوبصورت ہے؟ اس کے بدن سے آئڈو فارم کی بھینی بھینی بو آتی ہے؟ اس کی گردن دیکھ کر گردن توڑ بخار ہوتا ہے یا نہیں؟" نصیر یہ کہتا کہتا میز پر بیٹھ گیا "مینڈکوں کو جو زکام ہوتا ہے اس کا علاج تو وہ

وکیل صاحب جج صدر، چوکی کلاں کے بوڑھے محرر اور محلے کے دوسرے معتبر لوگوں کا خیال تھا سندر لال سے زیادہ جانفشانی سے اس کام کو کوئی اور نہ کر سکے گا۔ شاید اس لئے کہ سندر لال کی اپنی بیوی اغوا ہو چکی تھی اور اس کا نام بھی تھا لاجو ——— لاجونتی۔ چھوئی موئی۔

چنانچہ پربھات پھیری نکالتے ہوئے جب سندر لال بابو، اس کا ساتھی رسالو، اور نیکی رام وغیرہ مل کر گاتے ——— "ہتھ لائیاں کملان نی، لاجونتی دے بوٹے ......

تو سندر لال کی آواز ایک دم بند ہو جاتی اور وہ خاموشی کے ساتھ چلتے چلتے لاجونتی کی بابت سوچتا ——— جانے وہ کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی، ہماری بابت کیا سوچ رہی ہوگی۔ وہ کبھی آئے گی بھی یا نہیں؟ .... اور پتھریلے فرش پر چلتے چلتے اس کے قدم لڑکھڑانے لگتے۔

اور اب تو یہاں تک نوبت آگئی تھی کہ اس نے لاجونتی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا غم اب دنیا کا غم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دکھ سے بچنے کے لئے لوک سیوا میں اپنے آپ کو غرق کر دیا تھا۔ اس کے باوجود دوسرے ساتھیوں کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے اسے یہ خیال ضرور آتا ——— انسانی دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ ذرا سی بات پر اسے ٹھیس پہنچ سکتی تھی۔ وہ لاجونتی کے پودے کی طرح ہے جس کی طرف ہاتھ بھی بڑھاؤ تو مرجھا جاتا ہے۔ لیکن اس نے اپنی لاجونتی کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کوئی بھی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ وہ اسے جگہ بے جگہ اٹھنے بیٹھنے، کھانے کی طرف بے توجہی برتنے اور ایسی معمولی معمولی باتوں پر پیٹ دیا کرتا تھا۔

اور لاجو ایک پتلی "شہتوت" کی چھمک سی دیہاتی لڑکی تھی۔ زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ سانولا ہو چکا تھا لیکن طبیعت میں ایک عجیب طرح کی بیقراری تھی۔ اس کا اضطرار شبنم کے اس قطرے کی طرح تھا جو پارہ ہو کر بڑے سے پتے پر کبھی ادھر اور کبھی ادھر لڑھکتا رہتا ہے۔ اس کا دبلا پن اس کی صحت خراب ہونے کی دلیل نہ تھی۔ الٹا وہ ایک صحت مندی

ضرور جانتی ہوں گی۔ خدا کے لئے مجھے اس سے ملاؤ ورنہ مجھ پر ہسٹیریا کے دورے پڑنے لگیں گے۔"

جمیل نے ریاض کی طرف دیکھا۔ "ریاض اس کو کئی مرتبہ دیکھ چکا ہے۔"

"ریاض کے دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کو تو اندھ عورتا ہے۔" نصیر مسکرایا۔

جمیل نے پوچھا "یہ اندھ عورتا کیا ہے؟"

نصیر نے ریاض کے چشمہ لگے چہرے کو گھور کے دیکھا اور جمیل کو جواب دیا۔ "جناب یہ ایک بیماری کا نام ہے۔ آپ نے اندھ راتا تو سنا ہوگا جس کو شب کوری بھی کہتے ہیں یعنی نائٹ بلائنڈنس۔ اندھ عورتا بھی ایک بیماری ہے۔ اس کے مریض عورتوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ چاہے اصلی پتھر کا چشمہ لگائیں۔"

ریاض مسکرایا۔ "شاید اسی لئے مجھے مارگریٹ میں وہ حسن نظر نہ آیا۔ جس کی تعریف میں تونی نے زمین و آسمان کے قلابے ملا رکھے تھے۔"

تونی نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر ریاض سے صرف اتنا پوچھا "کیا وہ حسین نہیں تھی؟"

ریاض نے جواب دیا۔ "ہرگز نہیں۔ صاف ستھری لڑکی البتہ ضرور ہے۔"

"لانڈری سے تازہ تازہ آئی ہوئی شلوار کی طرح؟" نصیر ابھی اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ریاض بول پڑا۔ "ہاں یار۔ ایک دن اس نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ ان کپڑوں میں اچھی لگتی تھی۔ میں اور تونی موٹر میں تھے۔ تونی ڈرائیو کر رہا تھا۔ موٹر ہسپتال کے پھاٹک میں داخل ہوئی تو اسٹیرنگ تونی کے ہاتھوں کے نیچے پھسلا۔ لڑکی دیکھ کر ہمیشہ اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے سامنے دیکھا تو وہ شلوار قمیض پہنے مٹکتی چلی آ رہی تھی۔ تونی نے موٹر عین اس

کے پاس رو کی اور کہا "گڈ مورننگ"۔ وہ مسکرائی۔ لکھنوی انداز میں دایاں ہاتھ ماتھے تک لے گئی اور کہا۔ آداب عرض ..... جیسا لباس ویسی بولی۔ لونڈیا ہے چالاک۔ تونی ابھی کوئی فقرہ موزوں کر رہا تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے مگر تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی۔ تونی نے فقرے کو چھوڑا اور سینے پر دو ہتڑ مار کر کہا۔ مار ڈالا۔ اتنے میں مارگریٹ کا عکس بیک ویو مرر میں نمودار ہوا۔ تونی نے بڑے تھیٹری انداز میں ایک عدد چمّا اس کی طرف پھینکا۔ اور موٹر سٹارٹ کر دی۔"

"تمہاری اس گفتگو سے ثابت کیا ہوا؟" نصیر نے اپنے گھنگھریالے بالوں کا گچھا مروڑتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کہ جب تک یہ خاکسار بقلم خود اس لونڈیا کو نہیں دیکھے گا۔ کچھ بھی ثابت نہیں ہوگا۔ جھوٹ بولوں تو تونی ہی کا منہ کالا ہو۔"

توفیق خاموش سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔

جمیل نے اپنی کرسی ذرا آگے بڑھائی اور ریاض سے پوچھا۔ "اچھا بھئی یہ بتاؤ تونی نے اسے کبھی موٹر کی سیر نہیں کرائی؟"

ریاض نے جواب دیا۔ ایک دفعہ اس نے کہا تو تھا اس سے۔ مجھے یاد نہیں رہا۔ اس نے کیا جواب دیا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ تونی کو کھل کے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ٹمپریچر لینے یا ٹیکہ لگانے کے لئے آتی ہے تو باپ کی موجودگی میں یہ اس سے کیا بات کر سکتا ہے پھر بھی اشاروں کنایوں میں کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔ میرا خیال ہے، یہ اداس آج صرف اس لئے ہیں کہ اس کے ابا جان دو تین دنوں میں ہسپتال چھوڑنے والے ہیں کیوں کہ زخم اب بالکل بھر چکا ہے۔ کیوں تونی؟"

توفیق نے صرف اتنا کہا۔ "مجھے ستاؤ نہیں یار۔" اور اُٹھ کر باغ میں چلا گیا۔ نصیر نے اپنی ٹھوڑی ہاتھ میں پکڑی اور چہرے پر گہری فکرمندی کے نشانات پیدا کر کے کہا۔ "کہیں لمڈے کو اِسک تو نہیں ہو گیا؟"

"توفی اور عشق۔ دو متضاد چیزیں ہیں۔" ریاض کرسی پر سے اُٹھا۔ "کوئی اور ہی چیز ہوئی ہے جناب کو۔ میرا خیال ہے لاہور میں اس کا جی لگ گیا تھا۔ والد ٹھیک ہو گئے ہیں تو اب اسے واپس مری جانا پڑے گا۔"

"بکواس ہے۔" نصیر چلایا۔ "کوئی اور ہی بات ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔ میں ابھی دریافت کر کے آتا ہوں۔"

نصیر اُٹھ کر باہر چلنے لگا تو جمیل نے اس سے پوچھا۔ "کس سے دریافت کرنے چلے ہو؟"

نصیر مسکرایا۔ "گھوڑے کے منہ سے۔ انگریزی میں فرم دی ہارسز ماؤتھ" یہ کہکر وہ باہر نکل گیا۔

جمیل نے ریاض کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے پوچھا۔ "ہاں بھئی ریاض یہ سلسلہ کیا ہے۔ توفی ایک دن بہت تعریف کر رہا تھا اس مارگریٹ کی۔ کہتا تھا کہ معاملہ پٹا سمجھو۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہی ہو گا۔ میرا مطلب ہے ایسا کون سا چتوڑ گڑھ کا قلعہ ہے جو توفی کو سر کرنا ہے۔ ایک دن کوری ڈور میں کافی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔"

"کیا؟"

"میں نے پاکٹ بک میں نوٹ کی ہوئی ہیں کسی روز پڑھ کے تمہیں سناؤں گا۔" جمیل کے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "مذاق کرتے ہو یار۔ سناؤ۔ اور کوئی بات سناؤ۔ میرا مطلب ہے یہ بتاؤ کہ میں کبھی

اس نرس کو دیکھ سکتا ہوں۔"

"جب چاہو دیکھ سکتے ہو۔ ہسپتال چلے جاؤ۔ فیملی وارڈ میں تمہیں نظر آجائے گی لیکن کیا کروگے دیکھ کر، تمہارا قد بہت چھوٹا ہے وہ تم سے پوری ایک بالشت اونچی ہے۔"

"اس قد نے مجھے کہیں کا بھی نہیں رکھا۔ بہتیرے علاج کرا چکا ہوں ایک سوئی برابر اونچا نہیں ہوا۔ اچھا ہوا، میں نے کہا ریاض! باپ کی موجودگی میں تو فی اس سے اشارے بازی کیسے کرتا ہوگا۔ نہیں لڑکا ہوشیار ہے۔"

ریاض نے تاش کی گڈی اٹھائی اور پتے پھینٹنے شروع کیے۔ "اچھی خاصی مصیبت ہے ہر وقت یہی دھڑکا کہ والد صاحب دیکھ نہ لیں تاڑ نہ جائیں۔ کہتا تھا جونہی ان کی نگاہیں میری طرف اٹھتی تھیں۔ میں نظریں نیچی کرلیتا تھا۔ جب وہ آتی تھی تو دس پندرہ منٹوں میں غریب کو صرف تین چار موقعے آنکھ لڑانے کے ملتے تھے۔"

جمیل نے پوچھا۔ "ڈی۔ ایس۔ پی ہیں نا تو فی کے ابا جان؟"

"ہاں بھائی۔ باپ ہونا ہی کافی ہوتا ہے۔ اوپر سے ڈی۔ ایس۔ پی۔"

جمیل نے آہ بھری۔ "میرے تمام رومانس غارت کرنے والے میرے ابا جان ہیں۔ حج سے پہلے آپ کی غارت گری اتنی زوروں پر نہ تھی جب سے آپ خانہ کعبہ سے واپس تشریف لائے ہیں۔ آپ کی غارت گری عروج پر ہے۔ سوچتا ہوں شادی کرلوں۔ ایک لڑکا پیدا کروں اور بیٹھا اس سے اپنا انتقام لیتا رہوں۔"

ریاض مسکرایا۔ "حج کرنے جاؤ گے؟"

"ایک نہیں دس دفعہ صاحب زادے کو ساتھ لے کر جاؤں گا" یہ کہہ کر اس نے میز پر زور سے مکا مارا، آواز کے ساتھ ہی نصیر داخل ہوا۔ ریاض اور جمیل دونوں اس کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ نصیر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔

جمیل کے دماغ میں کھد بد ہونے لگی۔ "کچھ دریافت کیا؟"

"سب کچھ!" نصیر کا جواب مختصر تھا۔

ریاض نے پوچھا: "تو فی کہاں ہے؟"

نصیر نے جواب دیا: "چلا گیا ہے۔"

"کہاں؟" یہ سوال ریاض نے کیا۔

"واپس مری۔"

نصیر کا یہ جواب سُن کر ریاض اور جمیل دونوں بیک وقت بولے۔

"واپس مری؟"

"جی ہاں۔ مری واپس چلا گیا ہے۔ اپنی موٹر میں ہسپتال سے سیدھا یہاں کلب آیا۔ یہاں سے سیدھا مری روانہ ہو گیا ہے۔" نصیر نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔

جمیل بے چین ہو گیا۔ "آخر ہوا کیا؟"

نصیر نے جواب دیا "حادثہ"

جمیل اور ریاض دونوں بولے۔ "کیسا حادثہ؟"

"بتاتا ہوں" یہ کہہ کر نصیر نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی۔ جس میں کوئی سگریٹ نہیں تھا۔ ڈبیہ ایک طرف پھینک کر وہ ریاض اور جمیل سے مخاطب ہوا۔ "معاملہ بہت سنگین ہے۔"

جمیل نے ریاض سے کہا: "میرا خیال ہے ٹونی پکڑا گیا ہوگا۔"

ریاض نے کہا: "معلوم ایسا ہی ہوتا ہے۔ آدمی کب تک کسی کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے۔ ڈی۔ایس۔پی ہے۔ فوراً تاڑ گیا ہوگا۔ لیکن نصیر تم بتاؤ۔ ٹونی نے تم سے کیا کہا؟"

"بتاتا ہوں۔ ایک سگریٹ دینا جمیل۔"

جمیل نے اس کو ایک سگریٹ دیا۔ اُسے سلگا کر اس نے بات شروع کی "باپ کی موجودگی میں اس کی نرس سے اشارہ بازی ہوتی تھی۔ یہ تم لوگوں کو معلوم ہے۔ یہ سلسلہ اشارے بازی کا بہت دنوں سے جاری تھا۔ ٹونی اس میں خاصہ کامیاب رہا تھا۔ باپ کی موجودگی کے باعث اسے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا۔ وہ ذرا گردن گھماتے تو یہ فوراً اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا۔ ان دقتوں کے باوجود اس نے لڑکی سے ربط بڑھا ہی لیا۔ اوف ڈیوٹی کے روز شام کو وہ اسے ایک مرتبہ سنیما بھی لے گیا۔"

جمیل گنگنایا: "واہ۔"

ریاض نے کہا: "مجھ سے اس نے اس کا ذکر نہیں کیا۔"

نصیر نے سگریٹ کا کش لیا: "سنیما میں وہ خوب ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے۔ نرس کو ٹونی کا چنچل پن بہت پسند آیا۔ پرسوں کی ملاقات میں آج کی شام طے ہوئی کہ وہ ٹونی کے ساتھ دور تک موٹر میں سیر کرنے چلے گی۔ اور ٹونی اپنی عادت سے مجبور ہو کر اگر کوئی شرارت کرنا چاہے گا تو وہ بُرا نہیں مانے گی۔"

جمیل پھر گنگنایا: "واہ"

ریاض نے اسے ٹوکا: "خاموش رہو جمیل۔"

نصیر نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ "پرسوں کی ملاقات میں جو کچھ طے ہوا تھا میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ تو فی بہت خوش تھا۔ اپنے خیال کے مطابق وہ ایک بہت بڑا میدان مارنے والا تھا۔ آج دن بھر وہ اسکیمیں بناتا رہا۔ پٹرول کا انتظام اس نے کر لیا۔ کرم الٰہی نے اسے چھ کوپن دے دیئے تھے۔ اسی کی پرمٹ پر بیئر کی چھ بوتلیں بھی حاصل کر لی تھیں۔ جو غالباً ابھی تک امتیاز کے فریجڈیئر میں ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔ تو فی کی اسکیم یہ تھی کہ چنیوٹ کے پل تک چلیں گے۔ حسن و عشق کے دریا۔ چناب کی لہریں ہوں گی۔ موسم بھی خوشگوار ہوگا۔ گلاس راستے میں خرید لیں گے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر اڑے گی۔ خوب سرد رجمیں گے۔ لیکن ....." یہ کہہ کر نصیر ایک دم خاموش ہو گیا۔

جمیل نے بے چین ہو کر پوچھا "سارا معاملہ غارت ہو گیا؟"

نصیر نے اثبات میں سر ہلایا "سارا معاملہ غارت ہو گیا۔"

جمیل نے اور زیادہ بے چین ہو کر پوچھا "کیسے؟"

نصیر نے سگریٹ کی گردن ایش ٹرے میں دبائی اور کہا "پروگرام یہ تھا کہ وہ شام کو چھ بجے ہسپتال جائے گا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اپنے باپ کے پاس بیٹھے گا اس دوران میں جب مارگرٹ آئے گی تو وہ سیر کی بات پکی کرے گا بات پکی ہو جائے گی تو وہ سیدھا امتیاز کے ہاں جائے گا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے گا۔ بیئر کی ایک بوتل پیئے گا۔ باقی پانچ موٹر میں رکھے گا۔ اور جو جگہ مقرر ہوئی ہوگی وہاں مارگرٹ سے جا ملے گا۔ دل و دماغ سخت بے چین تھا۔ گھر سے کچھ وقت پہلے ہی نکل آیا۔ ہسپتال پہونچا۔ موٹر ایک طرف کھڑی کر دی۔ وارڈ کی طرف چلا۔ سیڑھیاں طے

گیں۔ اوپر پہونچا۔ کمرے کا دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہے ...."

نصیر ایک دم رُک گیا۔ جمیل اور ریاض دونوں بیک وقت بولے "کیا دیکھتا ہے ؟"

" دیکھتا ہے کہ ٹھیرو "۔ نصیر تھوڑی دیر کے لئے رُکا " میں تونی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں "۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مارگریٹ پلنگ پر جھکی ہوئی ہے اور والد صاحب۔ اور والد صاحب اس کے ہونٹ چوس رہے ہیں "۔

جمیل اور ریاض قریب قریب اچھل پڑے " سچ ؟"

نصیر نے جواب دیا " دروغ برگردن راوی "۔

جمیل جس کے دل و دماغ پر حیرت مسلّط تھی، بڑبڑایا " کمال کردیا۔ ڈی ایس۔ پی صاحب نے "

ریاض نے نصیر سے پوچھا " تونی نے کیا کیا ؟"

نصیر نے جواب دیا " آنکھیں نیچی کرلیں اور چلا آیا "۔

جمیل ریاض سے مخاطب ہوا " میرے والد صاحب قبلہ کبھی ایسے نظارے کا موقعہ دیں تو مزا آجائے۔ پتہ نہیں تونی کیوں اس قدر پریشان تھا ؟"

نصیر نے کہا " تونی کی والدہ صاحبہ اس کے ساتھ تھیں۔ تونی نے مجھ سے کہا۔ میں تو نظریں نیچی کر کے چل دیا۔ لیکن امی جان دروازہ کھول کر اندر کمرے میں چلی گئیں۔

جمیل نے پرافسوس لہجے میں کہا " قبلہ والد صاحب کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی "۔

(آفاق لاہور)

ہنس راج رہبر

للّی

"دیکھ بہن! للّی کا گھر والا آگیا" شیلا نے اپنی پڑوسن گوراں سے کہا۔ اور گوراں۔ شیلا کے ہاتھ کی سیدھ میں دیکھتی ہوئی بڑے اشتیاق سے بولی۔

"اچھا! کہاں ہے؟"

"وہ، ورے چارپائی پر جو سفید ٹوپی پہنے بیٹھا ہے۔ برادری کے چار پانچ آدمی چھوڑنے آئے ہیں۔"

"بہت دنوں بعد لوٹا ہے۔"

"للّی کی ماں بڑی خوش ہے۔ مہمانوں کے آگے پیچھے گھوم رہی ہے۔ پر جب اس کے بہنوئی نے للّی سے پوچھا۔ کہو، رکھو گی نا اسے اپنے پاس۔ تو للّی نے جھٹ جواب دیا۔ میں کیا کہوں۔ اس کی مرضی ہے۔ رہنا ہے تو رہے، جانا ہے تو جائے۔"

شیلا نے للّی کا جواب کچھ اس انداز سے دہرایا کہ گوراں بے ساختہ

ہنس پڑی اور ساتھ ہی ہاتھ مل کر اس نے للّی کی بے باکی پر تعجب کا اظہار بھی کیا۔

پھر یہ خبر آناً فاناً ساری بلڈنگ میں پھیل گئی۔ گوراں نے لکشمی کو اور لکشمی نے سوما کو سنائی اور اس طرح ایک کان سے دوسرے کان پڑتی اور پھیلتی چلی گئی۔ بات معمولی سی تھی لیکن اُسے سننے اور سنانے میں ہر ایک عورت خاص سرگرمی کا اظہار کر رہی تھی اور اس میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی تھی۔ ویسے یہاں ہر خبر یونہی پھیلتی تھی اور ہر ایک عورت اس پر رائے زنی کر کے اپنے جذبات کا اظہار کرتی تھی۔ بعض اوقات ان خبروں کی بدولت انھیں آنگن میں جمع ہو کر گفتگو کرنے کا اچھا خاصہ موضوع مل جاتا تھا۔ لیکن للّی کے گھر والے نتھو کا یکایک لوٹ آنا محض ایک خبر نہیں تھی بلکہ ایک ایسا اہم واقعہ تھا جو ایک عرصہ سے ان کی اپنی زندگی کا جزو بنا ہوا تھا اور جس کی بدولت آج للّی ساری گلی کی ہیروئن بنی ہوئی تھی۔ تب ہی تو یہ عورتیں اس میں اتنی دلچسپی لے رہی تھیں۔ ایک دوسری کو سُنا رہی تھیں اور ایک ہی بات کو بار بار دُہرا رہی تھیں۔ ہر ایک عورت کا لب ولہجہ اپنا تھا اور اُسے دہرانے کا ڈھنگ بھی اپنا تھا۔ لیکن جب وہ للّی کے یہ الفاظ دہراتی تھیں "رہنا ہے تو رہے۔ جانا ہے تو جائے" تو ہر ایک عورت کا سُر لگ بھگ ایک ہی ہوتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ الفاظ ادا کرتے وقت انھیں للّی کی شخصیت کو اُجاگر کرنا ہوتا تھا۔

للّی جمعدارنی ہے۔ نیچے گلی میں رہتی ہے۔ تین بچوں کی ماں ہے، جوان اور تندرست ہے اور رنگ روپ میں بھی عام عورتوں سے کافی اچھی ہے اس کے سب سے بڑے بچے کی عمر گیارہ سال ہے، وہ لڑکا ہے اور اس کا

کی نشانی تھی جسے دیکھ کر بھاری بھرکم سندر لال پہلے تو گھبرایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاجو ہر قسم کا بوجھ، ہر قسم کا صدمہ حتیٰ کہ مار پیٹ تک سہ گزرتی ہے تو وہ اپنی بدسلوکی کو بتدریج بڑھاتا گیا۔ اور اس نے ان حدوں کا خیال ہی نہ کیا جہاں پہونچ جانے کے بعد کسی بھی انسان کا صبر ٹوٹ سکتا ہے اور ان حدوں کو دھندلا دینے میں لاجونتی بھی تو معاون ثابت ہوئی تھی چونکہ دیر تک سوگوار نہ بیٹھ سکتی تھی اس لئے بڑی سے بڑی لڑائی کے بعد سندر لال کے ایک بار مسکرا دینے پر وہ اپنی ہنسی نہ روک سکتی اور صرف اتنا کہتی ــــ "اب کے مارو گے تو میں تم سے کبھی نہیں بولوں گی ....."

اور صاف پتہ چلتا تھا۔ وہ ایک دم ساری مار پیٹ کو بھول چکی ہے۔ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی جانتی تھی شوہر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں بلکہ عورتوں میں سے کوئی بھی تھوڑی سرکشی کرتی تو یہ لڑکیاں خود ہی ناک پر انگلی رکھ کر کہتیں ...." لے وہ بھی کوئی مرد ہے بھلا۔ دو ہاتھ کی عورت قابو میں نہیں آتی ....." اور یہ مار پیٹ ان کے گیتوں میں چلی گئی تھی۔ خود لاجو گایا کرتی تھی۔ میں شہر کے لڑکے سے شادی نہ کروں گی۔ وہ بوٹ پہنتا ہے اور میری کمر بڑی پتلی ہے۔ لیکن پہلی ہی فرصت میں لاجو نے شہر ہی کے ایک چھوکرے سے لو لگالی اور اس کا نام تھا سندر لال۔ جو ایک برات کے ساتھ لاجونتی کے گاؤں چلا آیا تھا اور جس نے دولھا کے کان میں صرف اتنا سا کہا تھا ــــــــ "تیری سالی تو بڑی نمکین ہے یار۔ بیوی بھی چٹ پٹی ہوگی" اور لاجونتی نے سندر لال کی اس بات کو سن لیا تھا اور وہ یہ بھول گئی کہ سندر لال نے کتنے بڑے اور بھدے بوٹ پہنے ہوئے ہیں اور اس کی اپنی کمر کتنی پتلی ہے۔

اور پربھات پھیری کے سمے ایسی ہی باتیں سندر لال کو یاد آتیں اور وہ یہی سوچتا ــــــ ایک بار، صرف ایک بار لاجو مل جائے تو میں اسے سچ مچ ہی دل میں بسالوں اور لوگوں کو بتا دوں ــــــ ان بے چاری عورتوں کے اغوا ہو جانے میں

نام چمن ہے، للّی چمن کو باقی دو چھوٹے بچوں کی طرح پیار کرتی ہے۔ لیکن کبھی جب کوئی گستاخی کر بیٹھتا ہے یعنی اس کا کہا ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو وہ اسے پیٹ بھی دیتی ہے۔ سارا سارا دن وہ گائے کے الہڑ بچھڑے کی طرح کھیلتا کودتا ہے۔ پڑھنے پڑھانے کی کسی کو فکر نہیں۔ فکر کیا ہوگی اس طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ آزادی کے بعد بھی ہندوستان میں تعلیم بیکار سی شے ہے۔ چمن اپنے باپ کی طرح میونسپلٹی یا ریلوے کے جمعداروں میں بھرتی ہو جائے گا۔ ایک جمعدارنی مل جائے گی اور وہ اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالے گا۔ یہی صدیوں پرانی روایت ہے جو اس کے باپ نتھو کو اپنے باپ سے وراثت میں ملی ہے اور چمن کو نتھو سے وراثت میں ملے گی۔ گاندھی جی کے اچھوت اُدھار نے اس وراثت کو کسی قدر شدھ ضرور کر دیا ہے۔ مگر بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں آیا۔

چمن کا باپ، للّی کا گھر والا، جس کا نام نتھو ہے ریلوے بھنگیوں میں ملازم تھا۔ کل ملا کر ساٹھ ستر روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ اس مہنگائی کے زمانے میں ایک کنبہ دار آدمی کے لئے یہ آمدنی بہت ہی تھوڑی ہے۔ لیکن وہ اس سے مطمئن تھے۔ روکھی سوکھی کھا کر گذر بسر کرتے تھے اور آرام سے رہتے تھے، میاں بیوی کو ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہیں تھی اس لئے ان میں کبھی کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوتا تھا۔ نتھو میں اور خواہ کوئی عیب ہو وہ لڑاکا اور جھگڑالو نہیں تھا۔ شرافت سے رہتا تھا۔ للّی ایسا متناسب جسم، گورا چٹا رنگ اور خدوخال کی تراش اس طبقہ کی عورتوں میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے اس لئے اس کی طرف نگاہیں ہی نہیں بعض اوقات انگلیاں بھی اُٹھ جاتی تھیں وہ صاف ستھرا پہنتی اور سلیقے سے رہتی تھی۔ یعنی اسے بھی اپنی خوبصورتی اور

امتیازی حیثیت کا احساس تھا۔ لیکن وہ طبیعت کی اوچھی نہیں تھی۔ اس احساس نے اُسے چنچل بنانے کے بجائے کچھ زیادہ بردبار بنا دیا تھا اور اس نے اپنی اس انفرادیت کو خاندان اور بچوں میں گھلا ملا دیا تھا۔ جس سے اس کا گھر سچ مچ کا گھر بنا ہوا تھا۔ جس میں فاختہ کے گھونسلے کا سا امن اور سکون تھا۔

زندگی جب امن اور اطمینان سے گذر رہی ہو تو اس میں چھوٹے چھوٹے حادثے بھی موت کی طرح بھیانک نظر آتے ہیں۔ للّی کے گھر میں یکایک ایک بہت بڑا حادثہ رونما ہوا اور اس حادثہ کی کوئی معقول وجہ بھی نظر نہ آتی تھی۔ اس لئے صرف للّی ہی نہیں محلّے والے بھی حیران اور ششدر رہ گئے۔ جس طرح اب نتھو کے لوٹ آنے کا چرچا ہو رہا تھا اسی طرح سال ڈیڑھ سال پہلے یہ سنسنی خیز خبر پھیلی تھی کہ للّی کا گھر والا اسے چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔

للّی نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ وہ چپ رہی۔ گیا سو گیا۔ اب اس کے کہنے سننے سے کچھ بننے سنورنے کا تو تھا نہیں۔ اُلٹا اور بگڑنے کا احتمال تھا۔ وہ چرچا کرے گی تو دوسروں کو بھی زبان کھولنے کا موقع ملے گا۔ اگر دس بیس نتھو کو بُرا کہیں گے تو پانچ دس خود اُسے بھی بُری کہنے والے نکل آئیں گے لیکن للّی کے چپ رہنے سے کیا ہوتا تھا۔ بات تو چھڑنی تھی اور وہ چھڑی۔ سب لوگ ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے۔ کچھ لوگوں کا تو کام ہی دراریں جھانکنا ہوتا ہے وہ کھوجتے رہتے ہیں کہ کون سی اینٹ کہاں سے اُکھڑی ہوئی ہے۔ ذرا ذرا سے واقعات کو خوب سونگھتے جانچتے ہیں اور بال کی کھال اُتارتے ہیں۔ سب جانتے تھے کہ نتھو کو للّی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ چلا گیا۔ اس لئے یہ واقعہ اہم تھا اور

اسی لئے یہ جاننا ضروری تھا کہ اس کا سبب کیا تھا؟ اس سلسلہ میں دو طرح کی باتیں مشہور ہوئیں۔ ایک رائے یہ تھی کہ وہ جوئے میں تنخواہ کا سارا روپیہ ہار گیا اور پھر للی کے ڈر سے لوٹ کر نہیں آیا۔ اور دوسری رائے یہ تھی کہ بھنگی بستی میں جہاں ان کی برادری کے لوگ اور کچھ رشتہ دار رہتے تھے وہ اکثر آیا جایا کرتا تھا وہاں اسے کسی دوسری عورت سے عشق ہو گیا۔ وہ عورت شاید اس کی بہن کی نند تھی یا اس کی بہن کے دیور کی بیوی تھی۔ رشتہ خواہ کچھ ہو وہ عورت تھی اور جوان تھی۔ نتھو کو اس سے عشق ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ عشق کسی سماجی یا سیاسی آئین کو قبول نہیں کرتا۔ اور وہ اس عورت کو لے کر بھاگ گیا۔

نتھو چونکہ شریف تھا اس لئے لوگوں یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ اس نے جوا کھیلا ہو، اور پھر عشق کی بات تو ایک دم ناقابلِ اعتبار معلوم ہوتی تھی۔ کیوں کہ جو آدمی اتنا شریف ہو کہ اس پر جوا کھیلنے کا الزام بھی عائد نہ ہو سکے تو وہ عشق کیا کرے گا؟ پھر وہ عورت للی سے زیادہ حسین کیا ہوگی! اس لئے اگرچہ نتھو کے بارے میں یہ دونوں ہی باتیں کہی اور سُنی جاتی تھیں لیکن ان میں سے ایک بھی درست ثابت نہیں ہوئی تھی۔ ویسے ہونے کو تو یہ دونوں باتیں ہی بیک وقت درست ہو سکتی ہیں۔ انسان خواہ کتنا ہی شریف ہو اس کے دل میں حسن اور آسودگی کی تمنا ہمیشہ رہتی ہے۔ ناآسودہ حسرتیں روح کو مضطرب اور بے چین کئے رکھتی ہیں۔

نتھو نے غریبی اور افلاس میں آنکھ کھولی تھی۔ عمر کڑی محنت کرتے گزری تھی۔ تنگی اور ترشی میں اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ زندگی اس ڈھنگ سے بسر ہوتی تھی کہ ہزاروں ارمان دل میں رہ جاتے تھے۔ تمام تلخیوں اور

محرومیوں کے باوجود اسے اگر کوئی تسکین تھی تو صرف یہ کہ للّی اس کی بیوی تھی۔ اس لئے وہ جواری اور اوباش نہیں بنا تھا۔ کولہو کے بیل کی طرح چپ چاپ ایک ہی ڈھرے پر چل رہا تھا اور اس سماج میں ایک ڈھرے پر چلتے رہنا شرافت کی بہترین سند ہے۔ چنانچہ نتھو بھی شریف تھا۔ لیکن شریف ہو کر بھی انسان انسان ہی رہتا ہے۔ بیل نہیں بن جاتا۔ نتھو بھی انسان تھا اور بے شک للّی اس کی بیوی تھی۔ لیکن ہمارے اس سماج میں بیوی حسین ہو سکتی ہے مگر خاوند کی معشوقہ اور دلبر نہیں ہوتی۔ میاں بیوی کا رشتہ کچھ ایسا بن گیا ہے کہ دونوں ایک سماجی بندھن میں بندھے ہوئے زندگی کی گاڑی کھینچتے ہیں اور رسم و رواج کا غیر مرئی ہاتھ انھیں صدیوں سے پٹی پٹائی راہ پر ہانکتا رہتا ہے۔ اس راہ پر چلتے چلتے زندگی اس قدر خشک اور بے کیف ہو گئی ہے کہ اکثر یہ جوا پھینک کر بے راہ روی اختیار کرنے اور کسی بھی سمت میں بھاگ کھڑے ہونے کو جی چاہتا ہے اور اسی جذبہ کے تحت اس بظاہر پُرامن زندگی میں حادثے بھونچال کی طرح آتے ہیں۔ نتھو بھی اپنی اس زندگی سے مطمئن نہیں تھا۔ صدیوں پرانی روایت نے اسے اکتا دیا تھا۔ للّی کی بدولت جو تسکین اُسے ملتی تھی۔ اس سے اس کی نیت نہیں بھرتی تھی۔ للّی تو گھر میں بیٹھی رہتی تھی محنت مزدوری وہ کرتا تھا۔ جھڑکیاں اور گھرکیاں سہتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں جو سکھ اور سکون ملتا تھا وہ بالکل ہیچ اور معمولی تھا۔ اسے جس مقدار میں خون سکھانا پڑتا تھا اس کے عوض مسرت بہت کم نصیب ہوتی تھی۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس نے اس بے کیف زندگی سے عاجز آ کر جوا کھیلا ہو اور عشق بھی کیا ہو۔ جوا میں ہار کر اس نے عشق کو معراج تک پہنچانے کی سوچی ہو اور وہ اس عورت کو لے کر بھاگا ہو۔

للّی جوئے اور عشق کی اس منطق سے ناواقف تھی۔ اس نے اپنا حسن، جوانی اور روح تک خاوند کے لئے وقف کر دی تھی۔ وہ اس سے بھی اسی ایثار کی توقع رکھتی تھی۔ لیکن نتھو نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ہرجائی ثابت ہوا تھا۔ جس مرد نے اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی وہ کیوں اس کی پروا کرے گی۔ اس نے گھر والے کے خلاف ذرا بھی شکایت نہیں کی۔ وہ جس ڈھنگ اور اطمینان سے پہلے رہتی تھی اسی ڈھنگ اور اطمینان سے رہتی رہی۔ زندگی کو اپنے ہی بل بوتے پر چلانے کے لئے اس نے محلہ میں صفائی کا کام شروع کر دیا۔ یہ محلہ اس نے ایک کام چور جمعدارنی سے خریدا تھا یعنی اسے سو سوا سو روپے قسطوں میں دینا منظور کر کے اس کا کام خود سنبھال لیا۔ اور وہ کام اس محنت اور لگن سے کرتی تھی کہ لوگ اس سے بے حد خوش تھے اور حیران تھے کہ جو للّی خاوند کی موجودگی میں تنکا بھی دوہرا نہیں کرتی تھی وہ اب روزی بھی کماتی تھی۔ بچے بھی پالتی تھی اور اسی طرح بن سنور کر رہتی تھی۔ جیسے نتھو کے وہاں رہنے یا چلے جانے میں اس کے نزدیک کوئی فرق ہی نہ تھا۔

فرق تھا تو شیلا، گوراں، سوما اور اس بلڈنگ کی دوسری عورتوں کے لئے۔ جن کے گھر والے کلرکی یا چھوٹا موٹا کاروبار کرتے تھے۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتی تھیں کہ مرد کے بغیر اکیلی عورت گھر کا خرچ چلا سکتی ہے۔ اس لئے وہ نتھو کے یکایک غائب ہونے کی خبر سُن کر بہت پریشان ہوئی تھیں۔ اور اپنے آپ اس چنتا میں گھلتی رہی تھیں کہ للّی بے چاری کیا کرے گی؟ اپنا اور بچّوں کا پیٹ کیسے پالے گی؟ ایسا سوچ کر جہاں انھیں للّی سے ہمدردی پیدا ہوتی تھی وہاں نتھو پر غصّہ بھی آتا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ بستا گھر بگاڑ دیا۔ لیکن بیچ میں کسی نے دلیل پیش کی۔ گھر کہیں نہیں بگڑتا۔ ان کا

کیا ہے؟ دھرم کرم تو کچھ ہوتا نہیں بس کسی طرح پیٹ بھرنا ہے۔ للّی کوئی دوسرا گھر کرلے گی اور چین سے رہے گی۔ جس جمعدار کے بھی جائے گی وہی اپنے بھاگ کو سراہے گا اور اس کے پاؤں دھوکر پیئے گا۔

لیکن جب للّی نے دھرم کی لاج بھی رکھ لی اور بستا گھر بھی بگڑنے نہیں دیا تو ان عورتوں کے دل میں اس کی وقعت اور بڑھ گئی۔ وہ اس کے ساتھ ہمیشہ ہمدردی سے پیش آتی تھیں اور حتی الوسع اس کی امداد کرتی تھیں۔ بلیک مارکیٹ زوروں پر تھی۔ کپڑے کے دام روز بروز بڑھ رہے تھے پھر بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا۔ وہ خود تنگی ترشی میں دن گذارتی تھیں اور پھٹا پرانا سی جوڑ کر پہنتی تھیں لیکن جب للّی کو ضرورت آپڑتی وہ اس کے لئے دھوتی، کرتہ، دوپٹہ یا اور کوئی کپڑا اجھٹ نکال کر دے دیتی تھیں۔ صبح شام اگر کبھی کھانا فالتو بچ رہتا تو وہ فوراً آواز دیتیں "للّی! چمن کو بھیج دے روٹی لے جائے" اور ہفتہ کے روز اسے جو ایک روٹی ہر ایک گھر سے ملتی تھی اس میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔

تین چار مہینے اسی طرح گذر گئے۔ للّی اپنا کام تندہی سے کرتی تھی اور جھاڑو دیتے وقت یوں مسکرایا کرتی تھی جیسے اسے محنت مشقت سے روحانی مسرت حاصل ہو رہی ہو۔ اس کی صحت بھی پہلے سے بہتر ہوگئی تھی۔ رنگ چٹے کی جگہ کچھ سرخ دکھائی دینے لگا۔ ایک دن بھنگی بستی سے گیارہ بارہ سال کا کوئی لڑکا گلی میں آیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر دریافت کرنے لگا کہ یہاں ایک عورت للّی اور اس کے بچے رہتے تھے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں للّی ہوں اور یہ میرے بچے ہیں" فوراً للّی نے جواب دیا۔

لڑکا گھبرایا اور فوراً اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا۔ لاکھ بُلانے پر بھی اس نے گھوم کر نہیں دیکھا۔ گلی کے نکڑ پر جا کر دم لیا۔

مگر لڑکے کی آمد کسی سے چھپی نہیں رہی۔ یہ خبر بھی اور خبروں کی طرح پھیل گئی۔ شیلا، گوماں اور سوما نے اس پر کافی دیر تک دماغ لڑایا اور آخر اس نتیجہ پر پہنچیں کہ بھنگی کے اس لڑکے کو للّی کے گھر والے نے بھیجا تھا۔ وہ للّی اور بال بچوں کی خیر خیریت جاننا چاہتا تھا۔ آدمی گھر سے چلا جائے لیکن اس کے گھر کا موہ تو نہیں جاتا۔

ڈیڑھ دو ماہ بعد بات کھلی۔ معلوم ہوا کہ جس عورت کے ساتھ نتھو بھاگ کر گیا تھا وہ چھ سات روز بعد ہی اپنے گھر لوٹ آئی تھی اور کہہ دیا تھا کہ میں تو اپنی موسی سے ملنے گئی تھی۔ اس برادری میں ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے جھوٹی ہونے پر بھی اس کی بات کا یقین کر لیا گیا۔ نتھو بھی کچھ عرصہ اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد بہن کے گھر لوٹ آیا اور وہیں رہنے لگا۔ اس کے لئے بہن کے گھر میں ہی نہیں رشتے داروں کے دل میں بھی کافی جگہ تھی اور اپنوں کے لئے یہ جگہ کبھی کم نہیں ہوتی۔ وہ گھر لوٹنا چاہتا تھا مگر شرم کے مارے آ نہیں سکتا تھا اور للّی سے ڈرتا تھا۔ وہ لڑکا سچ مچ اسی نے بھیجا تھا۔ اب کسی شخص کی زبانی یہ پیغام بھیجا تھا کہ للّی اگر اسے آکر لے جائے تو وہ گھر لوٹنے کو تیار ہے۔ لیکن للّی نے صلح کے اس پیغام کا نہایت تنک مزاجی سے جواب دیا۔

"میری جوتی اسے لینے جاتی ہے"

شیلا نے یہ بات سُنی اور پڑوسیوں کو سنائی اور اپنے خاوند و نود کو سُنائی۔ شیلا شروع سے للّی میں خاص دلچسپی لے رہی تھی۔ للّی کو اپنا کام آپ کرتے اور خود مختار زندگی بسر کرتے دیکھ کر اسے دلی راحت اور تسکین حاصل

ہوتی تھی۔ گوراں۔ شیلا۔ سوما اور دوسری عورتیں بھی اس کے باعث ملّی میں اتنی ہی دلچسپی لے رہی تھیں۔

شیلا کا خاوند نود ایک روزانہ اخبار کے دفتر میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا۔ ادبی ذوق رکھتا تھا۔ مطالعہ کے باعث زمانہ کے جدید رجحانات اور تقاضوں سے واقف تھا۔ وہ موجودہ سماجی ڈھانچے سے بیزار تھا اور اس کی روح ایک نئی زندگی کے لئے تڑپا کرتی تھی۔ اس نے اپنی تڑپ کا ایک حصّہ شیلا کی روح میں بھی منتقل کر رکھا تھا۔ وہ اسے ہر روز اخبار کی خبریں سنایا کرتا تھا اور دیس بدیس کے حالات بتا کر کہا کرتا تھا کہ جہاں انسان نے لوٹ کھسوٹ کو ختم کر کے ایک نئی دنیا تعمیر کر لی ہے وہاں عورت کو بھی مردوں کے برابر دفتروں اور کارخانوں اور دوسری جگہوں میں کام کرنے کا حق حاصل ہے وہاں عورت اپنی روزی کے لئے مرد کی محتاج نہیں ہے اور جب کسی قسم کی محتاجی نہ ہو تب ہی مرد اور عورت میں سچی محبت پیدا ہوتی ہے۔ تب ہی زندگی آگے بڑھتی ہے۔ ہم تو محبت کا سوانگ بھرتے ہیں۔ زبان سے خواہ کچھ بھی کہیں عورت کو اپنی لونڈی سمجھتے ہیں۔ ہمارے دیس میں بھی جب تک عورت اپنی روزی آپ نہیں کمائے گی وہ مرد کی غلامی سے آزاد نہیں ہو سکتی۔

شیلا اَن پڑھ تھی اور اس نے ایک چھوٹے سے قدامت پسند شہر میں پرورش پائی تھی۔ جب تک وہ باپ کے گھر تھی پڑھی لکھی عورتوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تھی۔ اسے ان کے چلن اور طور اطوار پر شک گذرتا تھا۔ مگر اب اس کا خیال کچھ بدل گیا تھا۔ وہ دیکھتی تھی کہ جو عورتیں پڑھ لکھ کر اُستانیاں بن جاتی ہیں۔ تار گھر یا ڈاک خانے وغیرہ کسی بھی دفتر میں کام کرتی ہیں وہ گھر میں بند اَن پڑھ عورتوں کے مقابلہ میں کہیں خوش نصیب ہیں

انھیں پیٹ بھرنے کے لئے مردوں کا منہ تو نہیں دیکھنا پڑتا۔ یہ سوچ کر اس کے دل میں ایک تمنا کسمسا اٹھی تھی اور وہ دنود سے کئی بار کہہ چکی تھی "میں کیا کروں۔ مجھے تو کسی نے پڑھایا ہی نہیں۔ مجھے ایک مشین ہی لا دو اور نہیں تو سینا پرونا ہی سیکھ لوں" دنود کہنے کو کہہ دیتا تھا "ہاں تمہارے لئے مشین ضرور خریدوں گا" لیکن اسے جو تنخواہ ملتی تھی اس سے گھر کا خرچ ہی مشکل سے چلتا تھا مشین خریدنے کے لئے اتنے پیسے کہاں سے بچتے؟ شیلا یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی اس بات سے نہایت دکھی رہتی تھی اور دکھ کا اظہار وہ کئی بار طعنے کی صورت میں بھی کرتی تھی "میں جانتی ہوں کہ تم مشین کیوں نہیں خریدتے۔ تم بھی مجھے اوروں کی طرح اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتے ہو"

دنود کی روشن خیالی اور شرافت کے باوجود شیلا کو عملی زندگی میں اپنی غلامی کا سو طرح احساس ہوتا تھا اور ایک دو مرتبہ تو وہ چڑھ کر کہہ بھی چکی تھی "میں یہ جانتی ہوں کہ تم یہ دھونس اس لئے جماتے ہو کہ مجھے روٹی کما کر دیتے ہو۔ لیکن میں تمہارے بنا کوئی بھوکی نہیں مر جاؤں گی۔ للی بھی تو اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے"

دیئے سے دیا جلنے کی طرح، شیلا کی روح میں جو شعلہ روشن تھا اس نے وہی شعلہ گوراں اور سوما کی روح میں بھی روشن کر دیا تھا۔ کیا ہوا اُن کے گھر والے روزی کمانے باہر جاتے تھے۔ وہ بھی تو گھر کے سینکڑوں کام کرتی تھیں۔ کھانا بناتی۔ کپڑے دھوتی اور بچے پالتی تھیں۔ گھر گرہستی کے چھوٹے بڑے کام جو انھیں دن رات کرنے پڑتے ہیں اگر اُجرت پر کرانے پڑیں تو شاید خاوند کی آمدنی سے دوگنا روپیہ بھی اس کے لئے کافی نہ ہو۔ اور اس

تنخواہ میں کبھی گذارہ نہ چلے۔ مثلاً گوراں کا گھر والا پریتم چند سرکاری دفتر میں ملازم تھا۔ مہنگائی بھتہ ملا کر ایک سو پانچ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی لیکن مزاج ایسا تھا کہ جیسے لاٹ صاحب بن گیا ہو۔ گوراں کو ایسا ڈانٹتا ڈپٹتا تھا جیسے دفتر میں بڑے بابو کی جھڑکیاں سہنا پڑتی تھیں اس کا سارا انتقام بیوی سے لے رہا ہو۔ آٹھ بجتے ہی دفتر جانے کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ کھانا پکانے میں دو منٹ کی دیر ہو جائے تو سارا گھر سر پر اٹھا لیتا تھا اور بھوکا چلے جانے کی دھمکی دیتا تھا۔ گوراں سب سہتی تھی اور منت خوشامد کر کے مناتی رہتی تھی لیکن اب اس نے بھی ایک روز تنگ کر کہہ دیا "بھوکے جانا ہے تو جاؤ۔ انگیٹھی میں تو کوئلے ہی جلیں گے۔ میں اپنی دیہہ نہیں جلا سکتی۔ جتنا ہم عورتیں جھکتی ہیں اتنا تم مرد شیر ہو جاتے ہو۔ یہ نہیں دیکھتے کہ تمہارے سورو پلی میں سارا گھر چلاتی ہوں" اس کے بعد بابو پریتم چند کی ناک کچھ سیدھی رہنے لگی ہے اور تیوری چڑھانے سے پہلے دس مرتبہ سوچتے ہیں۔

شیلا اور گوراں کی طرح سوما اور لکشمی نے بھی اپنی اس حالت کو محسوس کر لیا تھا اور اسی کارن وہ للی سے عملی ہمدردی کا اظہار کرتی تھیں اگر للی نے ایک مرد کے بھاگ جانے پر دوسرے مرد کی غلامی لکھوالی ہوتی تو وہ ایک عام سی بات ہوتی اور للی ان کی نگاہوں سے گر جاتی۔ لیکن اپنی آن پر قایم رہ کر اس نے جیسے شہادت کا درجہ حاصل تھا اسے دیکھ کر شیلا گوراں، سوما سب ہی کو تسکین ملتی تھی۔ اس کی مثال زندگی کو متحرک اور باعمل بناتی تھی۔

پھر نتھو مختلف ڈھنگوں سے پیغام بھیجتا رہا۔ لیکن للی برابر انھیں ٹھکراتی رہی نہ وہ اسے بلانے جاتی تھی اور نہ وہ خود آنے کو تیار تھا۔ جانتا تھا کہ ذات برادری

ان کا کوئی قصور نہیں۔ فسادیوں کی ہوسناکیوں کا شکار ہو جانے میں ان کی کوئی غلطی نہیں اور وہ سماج جو ان معصوم اور بے قصور عورتوں کو قبول نہیں کرتا، انھیں اپنا نہیں لیتا۔ ——— ایک گلا سڑا سماج ہے اسے ختم کر دینا چاہیئے ..... وہ ان عورتوں کو گھر میں آباد کرنے کی تلقین کیا کرتا اور انھیں ایسا مرتبہ دینے کی پریرنا کیا کرتا جو گھر میں کسی بھی عورت، کسی بھی ماں بیٹی، بہن یا بیوی کو دیا جاتا ہے اور کہتا انھیں اشارے اور کنائے سے بھی ایسی باتوں کی یاد نہیں دلانی چاہیئے۔ جو ان کے ساتھ ہوئیں۔ ——— کیونکہ ان کے دل زخمی ہیں، وہ نازک ہیں، چھوئی موئی کی طرح ——— ہاتھ بھی لگاؤ تو مرجھا جائیں گے۔

گویا "دل میں بساؤ" پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے محلہ لاشکور کی اس کمیٹی نے کئی پربھات پھیریاں نکالیں۔ صبح چار پانچ بجے کا وقت ان کے لئے موزوں ترین وقت ہوتا تھا۔ نہ لوگوں کا شور، نہ ٹریفک کی الجھن۔ رات بھر چوکیداری کرنے والے کتے تک بجھے ہوئے تنوروں میں سر دے کر پڑے ہوتے تھے۔ اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے لوگ جاگ کے صرف اتنا سا کہتے تھے ——— اوہ! وہی منڈلی ہے!" کبھی صبر اور کبھی تنک مزاجی سے وہ بابو سندر لال کا پروپگنڈا سنا کرتے۔ وہ عورتیں جو بڑی حفاظت سے اس پار پہونچ گئی تھیں گوبھی کے پھولوں کی طرح پھیلی پڑی رہتیں اور ان کے خاندان کے پہلو میں ڈنٹھلوں کی طرح اکڑے پڑے پڑے پربھات پھیری کے شور پر احتجاج کرتے ہوئے منہ میں کچھ منمناتے چلے جاتے یا کہیں کوئی بچہ تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں کھولتا اور "دل میں بساؤ" کے فریادی اور اندوہ گیں پروپگنڈے کو صرف ایک گانا سمجھ کے پھر سو جاتا۔

لیکن صبح کے سمے کان میں پڑا ہوا شبد بے کار نہیں جاتا۔ وہ سارا دن ایک تکرار کے ساتھ دماغ میں چکر لگاتا رہتا ہے اور بعض وقت تو انسان اس کے معنی کو

کے لوگ طعنہ دیں گے "چل تو بھی کوئی مرد ہے، عزت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے" گھر آنے کو جی بہت چاہتا تھا لیکن یہ ضد اور ہٹ دھرمی اسے روکے ہوئے تھی۔ سوچتا تھا کہ للّی کے سامنے گردن کیسے اُٹھے گی۔ اگر اس کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو اب تک دس مرتبہ گھر آگیا ہوتا۔ لیکن جو عورت اس قدر عزت اور وفا کا پاس رکھتی ہے اس کے سامنے مرد کو بھی عزت اور وفا کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ اسی لئے وہ للّی کو زیادہ چاہتا تھا، اسی لئے وہ گھر آنے کے لئے زیادہ بے تاب تھا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور وہ جھوٹی لاج چھوڑ کر اور برادری کے چار بزرگ آدمیوں کو ساتھ لے کر للّی کے دروازے پر آگیا۔ اسے للّی سے جس سلوک کی توقع تھی وہی ہوا۔ وہ چپ چاپ اور گمبھیر بنی رہی۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں بولی۔ جب پنچایت کے بزرگ نے صلح کی بات چیت چھیڑی تو اس نے بظاہر ملائمت لیکن بڑے ہی فخر سے جواب دیا "میں کیا کہوں جانا ہے تو جائے رہنا ہے تو رہے"

شیلا، گوراں اور سوما بھی ان الفاظ کو دہراتے ہوئے فخر محسوس کر رہی تھیں اور ان کی نگاہوں میں للّی کا قد پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا تھا۔

(شاہراہ دہلی)

کرشن چندر

میرا دوست

میرا دوست۔ لیکن میں اپنے کس کس دوست کا ذکر کروں۔ میرا دوست ایک تو وہ ہے جو ذرا شاعر مزاج ہے اور جو مجھ سے باتیں کم کرتا ہے لیکن میری بیوی سے زیادہ باتیں کرتا ہے۔ کہیں آپ اس کا اُلٹا سیدھا مطلب نہ لے لیں۔ دراصل وہ بڑا ہی معصوم جانور ہے اور زیادہ تر میری بیوی سے میرے متعلق ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔ بڑی ہی معصوم بھولی بھالی باتیں ہوتی ہیں وہ۔

مثال کے طور پر اسے معلوم ہے کہ میں کھانے میں کدّو سے سخت نفرت کرتا ہوں۔ ہر وہ شے جو دیکھنے میں یا کھانے میں کدّو سے مشابہت رکھتی ہے اس سے مجھے بڑی سخت نفرت ہے چاہے وہ آدمی ہو یا سبزی ترکاری۔ میرے دوست کو اس کا اچھی طرح سے علم ہے۔ اسی لئے وہ بڑے ہی مسکین انداز میں میری بیوی سے کہتا ہے۔

"میں دیکھ رہا ہوں چند دنوں سے آپ کے خاوند کا چہرہ اُترا اُترا

سا ہے "

بیوی کہتی ہے " ہاں میں بھی کچھ ایسا محسوس کر رہی تھی "

شاعر مزاج دوست کہتا ہے " کہیں کچھ کھانے میں کوئی کمی تو نہیں "

" نہیں تو " بیوی اب کے بڑے بھروسے سے کہتی ہے ۔

شاعر مزاج دوست سر ہلا کے کہتا ہے " پھر اُن کے چہرے کی رنگت سبزی مائیل زرد کیوں ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خوراک میں وٹامن نفی گ کی کمی ہے ۔ ایک دفعہ میرے چہرے کی رنگت بھی اسی طرح کی ہوگئی تھی ۔ تو ——— "

" تو ——— " میری بیوی جلدی سے پوچھتی ہے ۔

تو میرا دوست بڑی خطرناک ملائمیت سے جواب دیتا ہے " تو ڈاکٹر نے مجھے صبح و شام کدّو کی بھاجی کھانے کو دی تھی ۔ میں دوسرے ہی مہینے بھلا چنگا ہوگیا "

اب میری بیوی سر ہلا کے کہتی ہے " مگر وہ تو کدّو کھاتے ہی نہیں ۔ اس لئے وٹامن نفی گ کی کمی کیسے پوری ہوگی "

" یہی تو مصیبت ہے بھابی " میرا شاعر مزاج دوست افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے کہتا ہے ۔ تم ان کی بے جا ناز برداری کرتی رہتی ہو ۔ اور ان کی صحت خراب ہوتی جاتی ہے ۔ یہ وٹامن نفی گ کی کمی کیسے پوری ہوگی "

" تو میں کیا کروں "

" کدّو کھلاؤ "

" اور اگر وہ نہ کھائیں "

" کیسے نہیں کھائیں گے ۔ تم کھلاؤ تو ۔ ایک روز نہیں کھائیں گے ۔ دو روز نہیں کھائیں گے ۔ آخر جھک مار کر کھائیں گے "

چنانچہ اس مکالمے کے فوراً بعد ہی بندے کے گھر میں روز کدّو کی بھاجی ٹیبل پر دھری ہوتی ہے۔ کبھی کدّو کا حلوہ کبھی کدّو کا رائتہ کبھی کدّو کا شوربہ اور کبھی کدّو کا ملغوبہ، روز میز پر کسی نہ کسی صورت میں کدّو دھرا ہوتا ہے۔ جسے کھا کھا کے اچھی بھلی رنگت سبزی مائیل زرد ہوتی جاتی ہے۔ بیوی مسکراتی رہتی ہیں۔ لیکن آپ کو پتہ نہیں لگ سکتا کہ یہ کدّو دراصل کہاں سے آیا ہے۔ دوست اور دشمن کی پہچان ایک یہ بھی ہے کہ دشمن کی دشمنی کو آپ فوراً پہچان سکتے ہیں۔ لیکن دوست کی دوستی کبھی نہیں پہچان سکتے۔ خصوصاً ایسا دوست جو آپ کی بیوی کے ذریعہ آپ کو کدّو کھلانے کا عادی ہو۔

لیکن میرا دوست جو مجھے کدّو کھلاتا ہے۔ اس دوست کے مقابلے میں بیچ ہے جو مجھے غم کھلاتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ کدّو کھانے میں اور غم کھانے میں بہت فرق ہے۔ گو ذائقہ دونوں کا بُرا ہوتا ہے۔ پھر بھی کدّو کھاتے کھاتے آپ کو تپ دق نہیں ہوسکتا۔ لیکن متواتر غم کھانے سے ہوسکتا ہے۔ اس لئے میرا وہ دوست جو مجھے اکثر غم کھلاتا ہے۔ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔

اس کی تکنیک ہی عجیب ہے۔ دوسرے دوست تو اس وقت گھر میں آتے ہیں۔ جب میں گھر پر ہوتا ہوں۔ وہ بالعموم اس وقت آتا ہے جب میں گھر پر نہیں ہوتا ہوں۔ وہ بڑی جلدی میں تیز تیز قدم اُٹھائے اندر داخل ہوتا ہے اور آتے ہی مجھے زور زور سے آوازیں دینے میں مشغول ہوجاتا ہے۔ پھر ٹیبل پر پڑے ہوئے پھل دان میں سے سیب انگور ناشپاتی کھانے میں مصروف ہوجاتا ہے اور ساتھ ساتھ میں میری بیوی سے باتیں کرتا جاتا ہے۔

"تعجب ہے ابھی تک نہیں آئے" وہ سوال کرتا ہے۔

میری بیوی کہتی ہے "اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ وہ اکثر اس وقت گھر پہ نہیں ہوتے"

"تعجب کی بات ہے۔ مجھ سے تو اسی وقت ملنے کو کہا تھا۔ دوپہر کو سنیما کے اندر جاتے ہوئے ملے تھے"

"سنیما کے اندر جاتے ہوئے؟" میری بیوی گھبرا کے پوچھتی ہے۔

"ہاں! ہاں!" میرا دوست انگوروں کا ایک گچھا منہ میں ڈال کے جواب دیتا ہے "ان کے ساتھ میں غالباً آپ کی وہی رشتہ دار تھیں۔ وہ جو جوان سی ہیں۔ اور خوبصورت۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ بال سنہری اور کٹے ہوئے"

"مگر میری تو کوئی ایسی رشتے دار نہیں ہیں" میری بیوی اور بھی گھبرا کر جواب دیتی ہے ——— "جو خوبصورت ہو۔ جوان ہو اور جس کے سنہری بال کٹے ہوئے ہوں"

میرا دوست آدھا سیب منہ میں ڈال کر کہتا ہے "تو جانے دیجئے کوئی اور ہوں گی ——— آجائیں گے سنیما دیکھ کے وہ لوگ"

اس گفتگو کے بعد میرا دوست ناشپاتی کاٹنے میں مصروف ہوجاتا ہے اور میری بیوی میکے جانیکے لئے سامان باندھنے میں مصروف ہوجاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی سسکیوں کی آہستہ آہستہ آواز میرے دوست کے کانوں میں پڑتی ہے اور آپ بڑی خندہ پیشانی سے انھیں درسِ حیات دینے لگتے ہیں۔

"گھبرائیے نہیں بھابی۔ زندگی میں ایسا ہی ہوتا ہے"

"بھاڑ میں جائے ایسی زندگی"

"ممکن ہے بھابی مجھے دھوکا ہوا ہو"

"نہیں جی میں سب سمجھتی ہوں۔ وہ ہیں ہی ایسے"

"فرض کر لیجئے کہ ایسے ہیں بھابی، پھر بھی انھیں راہ راست پر لانا آپکا کام ہے۔"

"یہاں میں نے کوئی سکول نہیں کھولا ہوا ہے۔"

"بھابی آپ بھی غضب کرتی ہیں۔ آپ ہی نے انھیں اسی ڈھیل دے رکھی ہے۔ ورنہ وہ یوں تباہ نہ ہوتے۔ سچ کہتا ہوں بھابی جب تمہاری صورت دیکھتا ہوں۔ تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کہنے کو تو وہ میرا دوست ہے۔ مگر میں اس کا یہ ظلم نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس کو ہزار بار سمجھاتا ہوں۔ مگر کیا کروں وہ میری سنتا ہی نہیں۔ کمبخت۔ ظالم۔ بدمعاش۔"

اور وہ ——— میری بیوی رو رو کر کہتی ہے "بس انکے دوستوں میں تمہیں سب سے اچھے ہو"

"بھابی تمہاری جیب میں دس روپے ہیں۔" میرا دوست بڑی معصومیت سے پوچھتا ہے۔

اور پھر وہ دس روپے لے کے چلا جاتا ہے اور جب میں گھر آتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ گھر میں بجلی فیل ہو چکی ہے اور موم بتی کی روشنی میں دسترخوان پر سیب کے ٹکڑے پڑے ہیں۔ اور میری بیوی میکے چلی گئی ہے تو میں فوراً سمجھ جاتا ہوں کہ میرا دوست آیا ہوگا۔ وہی میرا دوست جو ہمیشہ میری غیر حاضری میں آتا ہے اور دس بیس روپے لے کے میری بیوی کا اسباب بندھوا کے اُسے میکے بھیج دیتا ہے۔ دوست اور دشمن کی پہچان ایک یہ بھی ہے کہ دشمن مردانہ وار آپ پر حملہ کرتا ہے۔ دوست "عورتانہ وار" بھی آپ پر حملہ کر سکتا ہے!

لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ اس طرح دس بیس روپے کھونے سے میرا زیادہ نقصان تو ہو نہیں سکتا لیکن گھبرایئے نہیں اس کے لئے میرا دوسرا دوست موجود ہے جو اُس کام کو وہاں سے شروع کرتا ہے جہاں سے میرے

پہلے دوست نے اُسے ناتمام چھوڑا تھا۔ دوست اور دشمن کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ دشمن دشمن کی مدد نہیں کرتا لیکن دوست دوست کی مدد ضرور کرتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سچا دوست وہی ہے جو مصیبت میں مدد کرتا ہے۔ میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ سچا دوست نہ صرف مصیبت میں مدد کرتا ہے بلکہ وہ مصیبت بھی خود ہی لاتا ہے۔ اور ایک مصیبت ہی نہیں بلکہ بہت سی مصیبتیں اکٹھی کر کے لے آتا ہے تاکہ مدد کرنے میں آسانی رہے۔

ایک اسی قسم کا سچا دوست، میرا دوست ہے جو مجھے اکثر کوئی نہ کوئی نیا بزنس شروع کرنے کے لئے کہتا رہتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگا "بھئی تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے رہتے ہو۔ کوئی بڑا دھندا کیوں نہیں کرتے؟"

"کیا کروں؟"

"فلم کا بزنس کرو۔ بڑا نفع ہے۔ بڑا دھندا ہے۔ وہ تم نے فلم دیکھی تھی۔ بندر، ریچھ۔ کہتے ہیں اس میں پروڈیوسر کو ڈھائی کروڑ کا فائدہ ہوا۔"

چنانچہ ہم نے اپنے دوست کی باتوں میں آ کے سات لاکھ کا نقصان کر ڈالا۔ بڑا دھندا تھا۔ اس لئے اور سب کو فائدہ ہوا سوائے ہمارے۔ اب ہمارے دوست نے کہا "دراصل دوست بڑے دھندے میں بڑا خطرہ ہے۔ اب تم چھوٹا دھندا کرو۔"

"کون سا چھوٹا دھندا کروں؟"

"یہی پان کی دوکانیں بہت سی خرید ڈالو۔ ہر نکڑ پر شہر میں ایک پان کی دوکان تمہاری ہو جائے۔ اور ہر دوکان پر تمہارا اپنا نوکر ہو۔ کوئی

ایک پچاس، سو دو کانیں کم از کم کھول لو۔ چھوٹا سا دھندا ہے۔ ہر دوکان سے روز پانچ روپے نفع آتا ہے۔ سو دوکانوں کا پانچ سو روپیہ روز آئے گا سال بھر کا تم حساب کر لو۔"

بڑا خوبصورت سا چھوٹا سا دھندا تھا۔ سال بھر کے بعد حساب کیا معلوم ہوا کہ اس سے تو فلم کا دھندا کیا بڑا تھا۔ بندر ریکھا بناتے بناتے بنا رسی پان بیچنے لگے۔ معلوم ہوا شہر کے بیچ میں جو بڑا ہوٹل اپنا تھا وہ اب اپنا نہیں ہے۔ مکان بھی اپنا نہیں ہے اور موٹر دوست نے گروی رکھ لی ہے۔ اور اب وہ اس کے اسٹیرنگ وہیل پر سر جھکا کے مجھ سے کہتا ہے۔" دوست یہ سب دھندے پرانے ہو چکے۔ اب کوئی نیا دھندا کرو۔"

"کون سا نیا دھندا؟"

"پلاسٹک کی چوڑیاں تیار کرو۔"

چنانچہ اب کے میں نے نیا دھندا کیا۔ یہ میرا آخری دھندا تھا۔ میں نے پلاسٹک کی چوڑیاں تیار کیں اور پھر انھیں پہن کر اپنے گھر بیٹھ گیا۔ اب چھوٹے بڑے نئے پرانے سب دھندے ختم ہو چکے۔

لیکن گو دھندے ختم ہو جاتے ہیں۔ دوست کبھی ختم نہیں ہوتے ہیں اس کے علاوہ دوست اور دشمن کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ آدمی دشمن کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیکن دوست کا مقابلہ کسی حالت میں نہیں کر سکتا۔ یہ وضعداری کے خلاف ہوگا۔ اس کا تجربہ مجھے اپنی تازہ ترین علالت کے دوران میں ہوا۔ کیونکہ جیسا کہ بزرگوں نے کہا ہے۔ جب سب دھندے ختم ہو جاتے

ہیں تو بیماری شروع ہو جاتی ہے۔ اب کے مجھے میرے ڈاکٹر دوست نے بتایا کہ مجھے کچھ نہ ہونے کی بیماری ہے۔ آپ یہ سُن کر ضرور حیران ہوں گے کہ یہ کچھ نہ ہونے کی بیماری کیا ہوتی ہے۔ تو سُنئے۔ بیماریاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو ہوتی ہیں۔ یعنی آپ کو سردی ہو گئی۔ مجھے گرمی ہو گئی۔ آپ کو پیچش ہو گئی۔ مجھے دق ہو گئی۔ آپ کو کوڑھ ہو گئی۔ مجھے حیرت ہو گئی ..... یہ تو ہوئیں ہونے کی بیماریاں۔ دوسری ہوتی ہیں نہ ہونے کی بیماریاں۔ جن میں کچھ نہ ہونی کی وجہ سے کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کے جسم میں کیلشیم نہیں ہوتا ہے تو آپ کو کیلشیم نہ ہونے کی بیماری ہو جاتی ہے۔ لوہا نہیں ہوتا ہے تو لوہا نہ ہونے کی بیماری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح وٹامن فاسفورس، نمک اور مٹی کا تیل نہیں ہوتا ہے۔ تو جسم کا Stove بجھا بجھا سا رہتا ہے چنانچہ اب کے میری تازہ علالت جسم میں آئیوڈین کے نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ ڈاکٹر نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے مجھے ایک عمدہ سا انجکشن دیا۔ اور چلا گیا۔ اس کے بعد میری شامت آئی۔ میرا مطلب ہے میرا دوست آیا۔

میرا یہ دوست بڑا معصوم اور بھولا بھالا ہے۔ اس کا لباس ڈھیلا ڈھالا ہے اور وہ دیسی ٹوٹکوں کا متوالا ہے۔ گویا بالکل گڑبڑ بھالا ہے۔ وہ آتے ہی لمبوترا سا منہ بنائے میرے سرہانے بیٹھ کے مجھ سے پوچھنے لگا۔

"کیا تکلیف ہے دوست؟"

"جسم میں آئیوڈین نہیں ہے۔"

"تو ٹنکچر آئیوڈین پیو۔ میرے گھر پر رکھی ہے۔"

میں نے کہا "ٹنکچر آئیوڈین پیتے نہیں لگاتے ہیں۔"

وہ بولا "میرے خیال میں گھوڑوں کو پلاتے ہیں"

میں نے کہا "میں گھوڑا نہیں ہوں"

وہ بولا "معاف کرنا۔ میں بھول گیا۔ میں نے سمجھا۔ میں ریس کورس میں بیٹھا ہوں"

اس کے بعد تھوڑی دیر تک وہ چپ رہا۔ پھر سوچ سوچ کر بولا "میرے خیال میں تم ہلدی پیو تو اچھا ہے"

میں نے کہا "تمھیں ہلدی کا خیال کیوں آیا"

وہ بولا "ہلدی اور آیوڈین کا رنگ ملتا ہے۔ اس لئے مزاج بھی ملتا ہوگا۔ اور تاثیر بھی۔ اس لئے تم ہلدی ضرور پیو۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ دیکھو اب تم ضد نہ کرو۔ تم نہیں سمجھتے ہو۔ میں تمھارے بھلے کے لئے کہہ رہا ہوں"

میرے دوست میں یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ سب سمجھتا ہے۔ اور میں کچھ نہیں سمجھتا ہوں۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور میں کچھ نہیں جانتا ہوں۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے اور میں کچھ نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ گو میرا دوست ڈاکٹر، وید یا حکیم نہیں ہے، تو کیا ہوا۔ وہ نہیں ہے مگر اس کا دادا تو تھا۔ اور اس کے دادا جی کے بتائے ہوئے ٹوٹکے آج تک ہمارے گھر سے قبرستان تک چلتے ہیں۔ اس لئے اس نے اصرار کر کے مجھے ہلدی پانی میں گھول کر پلا دی۔ پھر میرے پیٹ پر ہلدی کا لیپ کر دیا۔ میری آنکھوں میں ہلدی کا سرمہ لگا دیا۔ اور میرے ماتھے پر ہلدی بکھیر کر مجھے اپنی دانست میں اگلے جہان پہنچا کر مجھ سے رخصت ہو گیا۔ یہی سچے دوست اور دشمن کی پہچان ہے کہ دشمن آپ کی خوبیوں پر نگاہ رکھتا ہے اور آپ کی کمزوری پر حملہ کرتا ہے

بھی نہیں سمجھتا پر گنگناتا چلا جاتا ہے اور اسی آواز کے گھر کر جانے کی بدولت ہی تھا کہ انھیں دنوں جبکہ مس مردولا سارا بھائی ہند اور پاکستان کے درمیان اغوا شدہ عورتیں تبادلہ میں لائیں تو محلہ شکور کے کچھ آدمی انھیں پھر سے بسانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ان کے وارث شہر سے باہر چوکی کلاں پر ان سے ملنے کے لئے گئے۔ مغویہ عورتیں اور ان کے لواحقین کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر سر جھکائے اپنے برباد گھروں کو پھر سے آباد کرنے کے کام پر چل دیئے۔ رسالو اور نیکی رام اور سندر لال بالو کبھی "مہندر سنگھ زندہ باد" اور کبھی "سوہن لال زندہ باد" کے نعرے لگاتے ..... اور وہ نعرے لگاتے رہے حتیٰ کہ ان کے گلے سوکھ گئے .....

لیکن مغویہ عورتوں میں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں، جن کے ماں باپ بہن اور بھائیوں نے انھیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں؟ اپنی عفت اور عصمت کو بچانے کے لئے انھوں نے زہر کیوں نہ کھا لیا؟ کنوئیں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سیکڑوں ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان لے لی لیکن انھیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس قدر بہادری سے کام لے رہی ہیں اور کس طرح پتھرائی ہوئی نگاہوں سے وہ موت کو گھور رہی ہیں۔ اس دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انھیں نہیں پہچانتے پھر ان میں سے کوئی جی ہی جی میں اپنا نام دہراتی ہے ــــ سہاگ ونتی ــــ سہاگ والی ..... اور اپنے بھائی کو اس جم غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا سا کہتی ہے ..... تو بھی مجھے نہیں پہچانتا۔ بہاری میں نے تجھے گودی میں کھلایا تھا رے۔ ..... اور بہاری چلا دینا چاہتا ہے۔ پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا ہے اور ماں باپ اپنے جگر پہ ہاتھ رکھ کر نارائن بابا کی طرف

دوست آپ کی خوبی، کمزوری اور بیماری تینوں پہ نگاہ رکھتا ہے اور چاروں طرف سے حملہ کرتا ہے۔ دشمن کا وار کبھی نہ کبھی خالی چلا جاتا ہے ـــــ لیکن دوست کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔

برسوں میرا دوست اپنے خاندانی ٹوٹکوں کے طفیل مرگیا اور مرتے وقت مجھے ایک بیوہ اور گیارہ بچے اور بہت سے لمبے چوڑے قرضے کی ذمہ داری سونپ گیا۔ وصیت میں میرے لئے اپنا پیارا خارش زدہ کتا بھی میرے حوالے کرگیا۔ آج کل میں روز اس خارش زدہ کتے کو نہلاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ دشمن کی دشمنی اس کے مرنے پر ختم ہوجاتی ہے۔ لیکن دوست کی دوستی اس کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ بلکہ قیامت تک آپ کا ساتھ دیتی جاتی ہے!

(شاہراہ دہلی)

سُدرشن

دیوالی

رام ناتھ دوکان پر جانے لگا تھا شانتا نے اس کی جیب میں رومال رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا ——— "شریمان جی کو معلوم ہو کہ پرسوں دیوالی ہے۔ اب بتا دو کیا کیا کرنا ہوگا بعد میں کہو گے کہ یہ نہیں کیا وہ نہیں کیا۔"

دیوالی دوسروں کے لئے تو معمولی تیوہار ہوگا مگر رام ناتھ کے لئے تیوہار نہیں بلکہ ایک رنگین سپنا ہے جسے وہ برسوں سے ترستا رہا ہے۔ شادی کے بعد یہ اس کی پہلی دیوالی ہے۔ اس دیوالی کے لئے اس نے کیسے کیسے منصوبے باندھے ہیں اس دیوالی کا اس نے کتنی بے تابی سے انتظار کیا ہے اسے وہی سمجھتا ہے کوئی دوسرا نہیں۔

اسے آج سے بیس برس پہلے کا وہ دن یاد آگیا جب اس کی بھابی اور بھائی نے شادی کی پہلی دیوالی منائی تھی اور سارے گھر کو دیپک محل بنا دیا تھا اس وقت وہ پانچ چھ سال کا معصوم بچہ تھا۔ خوشی سے گھر میں

دوڑتا پھرتا تھا۔ گاتا پھرتا تھا مگر اس لئے نہیں کہ اس کے گھر میں دیئے جلے تھے۔ اس لئے بھی نہیں کہ اس کے گھر میں مٹھائیاں آئی تھیں یا اسے پٹاخے ملے تھے بلکہ اس لئے کہ اس کے گھر میں اس کی گوری پتلی اور شرمانے والی بھابی نے بڑھیا بڑھیا کپڑے پہنے تھے اور اس کے ساتھ مل کر دیوالی کا سارا انتظام کیا تھا۔ اس کی بھابی حسین تھی مگر آج اس کا حسن چراغوں کی روشنی میں چمکا ہوا تھا۔ نکھرا ہوا تھا اور سنورا ہوا تھا ایسی خوبصورت وہ پہلے کبھی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا چراغوں کی روشنی نے اس کے روپ کو چار چاند لگا دیئے ہوں جیسے اس کا روپ کئی گنا بڑھ گیا ہو وہ بار بار بچپن کی حیران اور بڑی بڑی آنکھوں سے بھابی کو دیکھتا تھا۔ اور بچوں کی طرح کھلا جاتا تھا۔ اس دن گھر کے دیئے مسکراتے تھے۔ دیوار بھی مسکراتی تھی۔ کونا کونا مسکراتا تھا اور رام ناتھ اپنے ننھے سے دماغ میں سوچتا تھا۔ پریاں ایسی ہی ہوتی ہوں گی جیسی بھابی ہیں اور پرستان میں ہر رات اس طرح دیئے جلتے ہوں گے۔

دیوالی کے چراغوں کی روشنی میں بیٹھ کر جب رام ناتھ اور اس کی بھابی اور اس کا بھائی دیوالی کی مٹھائیاں کھانے لگے تو رام ناتھ نے بھولے پن سے پوچھا "کیوں بھابی جی! یہ دیوالی پھر کب آئے گی؟"

اور اس نے بھابی جی کے "جی" پر خاص زور دیا۔ بھابی نے اپنی ریشمی ساڑھی میں لال اور پتلے ہونٹوں سے مسکرا کر کہا — "دیور جی اگلے سال آئے گی"

اور اس نے بھی دیور جی کے "جی" پر خاص زور دیا۔

رام ناتھ نے پھر پوچھا "اور اگلے سال بھی اتنے ہی دیئے جلیں گے؟"

بھابی نے پہلے کنکھیوں سے خاوند کی طرف دیکھا پھر جلتے ہوئے چراغوں کی طرف اور پھر مسکرا کر کہنے لگی: "پگلا کہیں کا۔ ہر سال اتنے دیئے کیسے جل سکتے ہیں؟ اب اتنے دیئے تیری شادی کی پہلی دیوالی پر جلیں گے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ اگلے سال جلیں تو جلدی جلدی شادی کرے۔ کوئی لڑکی پسند کی ہے تو نے بیاہ کے لئے، جو اگلے سال ریشمی کپڑے پہن کر تیرے گھر میں چھم چھم کرتی پھرے؟"

رام ناتھ نے "دُت" کہا اور شرما کر کمرے میں بھاگ گیا۔ بھابی جی نے اونچی آواز سے کہا: "اچھا بابا آجا اب میں کچھ نہیں کہتی۔"

مگر رام ناتھ باہر نہیں آیا۔ ہار کر بھابی اندر گئیں اور دیکھا کہ راموں اوندھے منہ پڑا رو رہا ہے۔ بھابی نے پیار سے کہا: "ارے واہ! اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ چل اپنے پٹاخے چلا۔"

پھر اونچی آواز سے اپنے خاوند کو سنا کر بولی: "میں نے کہا۔ ذرا دیکھئے تو راموں رو رہا ہے۔ بھلا کوئی آج کے دن بھی روتا ہے۔ اگر روتا ہے تو اس سے دیوالی خفا ہو جاتی ہے اور دوبارہ نہیں آتی۔"

اس کے بعد بھائی اور بھابی نے مل کر اسے منایا اور اسے پٹاخے دے کر چھت پر بھیج گئے اور رام ناتھ اپنے دل میں سوچتا تھا۔ وہ دن کب آئے گا جب میری شادی ہوگی۔ شادی کے بعد دیوالی آئے گی اور میری بیوی بھی بھابھی کی طرح ریشمی ساڑھی پہن کر دیئے جلائے گی۔ گھر جگ مگ کرے گا اور میں بھائی صاحب کی طرح مسکراؤں گا۔

اور آج وہ دن آگیا اور اس کی بیوی کہہ رہی تھی: "پرسوں دیوالی ہے بتاؤں کیا کیا کرنا ہوگا۔ اُس دن۔"

رام ناتھ جاتے جاتے رُک گیا اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے بولا: "یہ ہماری پہلی دیوالی ہے نا؟ ——— یہ دیوالی تو بڑی رنگین ہونی چاہیئے۔ سارا سال یاد آتی رہے۔"

شانتا نے پیار کے بناوٹی غصّہ سے سر اٹھایا اور اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ کر بولی: "چلو، ہٹو تم تو چھیڑتے ہو۔" پھر تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ "ہاں یہ ہماری پہلی دیوالی ہے۔"

رام ناتھ نے شانتا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا: "کتنے دیئے لیتا آؤں؟ ———"

شانتا بولی: "پچاس۔"

رام ناتھ نے کہا: "پچاس کم ہوں گے۔"

شانتا: "سَو"

رام ناتھ: "سَو بھی کم ہوں گے۔"

شانتا: "تو دو سَو ہی سہی۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔"

رام ناتھ: "دو سَو بھی کم ہیں۔"

شانتا کے چہرے پر پھول کھل گئے۔ بولی: "دو سَو بھی تھوڑے ہیں تو ہزار لے آؤ۔ تین ہزار لے آؤ۔ چار ہزار لے آؤ۔ مگر اتنا سوچ لو کہ صرف دیئے لانا ہی کافی نہ ہوگا۔ ان کے لئے تیل بھی چاہیئے ہوگا۔ جلانے کے لئے وقت بھی چاہیئے۔ اور ہم گھر میں صرف دو آدمی ہیں۔"

رام ناتھ نے پیار سے کہا: "تو نہیں جانتی شانتا۔ میں اس دیوالی کے کیا کیا سپنے دیکھ رہا ہوں اور اس کے لئے کس طرح تڑپتا رہا ہوں۔ آج میں اپنے گھر کو روشنی سے معمور کر دینا چاہتا ہوں۔ تو بھی کیا یاد کرے گی کہ

تو نے اپنے بیاہ کی دیوالی منائی تھی۔ آج میرا گھر دیپک گھر بنے گا۔ میری شانتا دیپ گھر کی رانی بنے گی۔ ادھر ادھر پھرے گی اور میں دیکھ کر خوش ہوں گا۔

شانتا نے میٹھی باتیں سُنیں تو وہ بھی رنگ اور روشنی کی دنیا میں پہنچ گئی اس کے بعد انھوں نے دیوالی کا پروگرام بنایا۔ چیزوں کی فہرست تیار کی۔ خرچ کا اندازہ لگایا۔ پھر دیوالی کی موہنی رات کا منظر تفصیلات کی آنکھوں سے دیکھا اور پیار کے دونوں دیوانے مستی سے جھومنے لگے۔

(۲)

شام کو رام ناتھ گھر لوٹا تو اس کے ساتھ دو مزدور تھے اور مزدوروں کے سروں پر کافی سامان تھا۔ مٹی کے دیئے تھے سرسوں کا تیل تھا۔ بتیوں کے لئے روئی تھی۔ پھلجھڑیاں تھیں۔ پٹاخے تھے۔ موم بتیاں تھیں۔

شانتا نے ایک ایک چیز کو دیکھا اور بڑی بڑی موم بتیاں دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی۔ اس نے پوچھا جب دیئے آئے ہیں تو موم بتیوں کی کیا ضرورت ہے؟ ایک چیز لاتے۔ دیئے یا موم بتیاں۔

رام ناتھ نے کہا۔ دیئے اس لئے کہ بیٹھ کر جلیں گے۔ موم بتیاں کھڑی ہو کر جلیں گی۔ ذرا تصورات کی آنکھوں سے دیکھ۔ ایک دیئوں کی لمبی قطار۔ اور اس میں ہر پانچ دیئوں کے بعد ایک اونچی موم بتی۔ کیسی عجیب چیز ہوگی۔ اور دیکھنے والے کتنے حیران ہوں گے۔ کہیں گے۔ بھائی اس آدمی نے تو یہ نئی بات پیدا کی ہے اسے۔ کہتے ہیں چراغوں کی شاعری۔ یہ آدمی تو پورا شاعر ہے شاعر۔

شانتا نے پیار کے غصہ سے کہا۔ ارے واہ! بتیاں میں بناؤں گی،

دیئے میں جلاؤں گی۔ دیواریں میں سجاؤں گی اور لوگوں کی تعریف آپ سنیں گے۔ یہ سراسر ظلم ہے اگر آپ اپنی تعریف کرانا چاہتے ہیں تو سارا کام کیجئے۔ یہ کیا کہ دکھ تو سہے فاختہ اور انڈے کھائے کوّا۔

رام ناتھ کو ہنسی آگئی۔ یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے۔ کام کوئی کرتا ہے۔ اور انعام دوسرا لے جاتا ہے۔

شانتا نے کہا۔ یہ بات جھوٹ۔ جو کام کرے گا وہی انعام لے گا۔ جو کام نہیں کرے گا وہ انعام بھی نہیں لے گا۔ آج کل مزدوروں کا دور ہے۔ امیروں کا زمانہ گیا۔ انعام چاہتے ہو تو کام بھی کرو۔

رام ناتھ نے کہا۔ جس دوکان پر میں کام کرتا ہوں اس کا مالک کوڑی کا کام بھی نہیں کرتا مگر سارا منافع اسے ملتا ہے۔ ہمیں صرف تنخواہ ملتی ہے بتاؤ اس کا کیا مطلب ہے؟

شانتا کو شرارت سوجھی۔ ہنستے ہنستے بولی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ بی فاختہ ہیں اور آپ کا مالک کوّا ہے۔ آج سے میں آپ کو بی فاختہ کہا کروں گی۔

یہ کہہ کر اس نے اپنی ساڑھی کا پلّو منہ میں ٹھونس لیا۔ مگر ہنسی رُکتی نہیں تھی۔ رام ناتھ نے کہا۔ اور میں اپنے مالک کو کوّا کہا کروں گا اور وہ ہے بھی کوّا۔ ایسا ہی کالا۔ نگاہ کا تیز۔ اس کی طرح سے ہی کائیں کائیں کرنے والا۔ ہر ایک چیز کو دور سے دیکھ لیتا ہے۔

دونوں نے کھانے کے بعد دیئے بھگوئے اور روئی کی بتیاں بنانے لگے۔ ہنستے تھے۔ ایک دوسرے سے مذاق کرتے تھے اور دیوالی کے دیئوں کے لئے بتیاں بناتے جاتے تھے۔ بارہ بجے تک دونوں جاگتے

رہے۔ اور جب سوئے تو ان کی خوشی ان کے سپنوں میں جاگ اٹھی۔

مگر رام ناتھ جس دوکان پر کام کرتا تھا اس کا مالک اتنا بُرا نہ تھا۔ اس میں بُرائیاں تھیں تو اچھائیاں بھی تھیں بلکہ بُرائیاں کم اور اچھائیاں زیادہ تھیں۔ بُرائیاں یہ تھیں کہ وہ اپنے آدمیوں سے قصائیوں کی طرح کام لیتا تھا۔ جھوٹ بولنے میں بھی اسے عار نہیں تھا۔ وعدہ کرکے مُنکر ہوجانا اس کے لئے معمولی بات تھی۔ اچھائیاں یہ تھیں کہ وہ زبان کا بڑا میٹھا تھا۔ کڑوا بولنا جانتا ہی نہیں تھا۔ دوکان کے دربان کو بھی "جی" کہہ کے بلاتا تھا۔ ہر ملازم کو ہر مہینے انعام دے دیتا۔ لباس کا سادہ تھا۔ چال چلن کا نیک تھا۔ قومی تحریکوں میں دلچسپی لیتا تھا۔ دان دینے میں کبھی پیچھے نہ رہتا تھا۔ جو چندہ مانگنے آتا اسے خالی ہاتھ نہ لوٹاتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس سے لوگ بھی خوش تھے بھگوان بھی خوش تھا۔

دوسرے دن جب رام ناتھ دوکان پر گیا تو اس سے لالہ جی نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ کل ہمارے پوتے کی پہلی دیوالی ہے۔ شام کو دوکان کے آدمیوں اور ان کے گھر والوں کی ہمارے ہاں دعوت ہے آپ لوگ بھی تشریف لائیں گے اور میں "نہ" نہیں سنوں گا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو رام ناتھ دعوت کی بات سُن کر اچھل پڑتا مگر اس وقت اسے ایسا معلوم ہوا کہ لالہ جی نے اسے دعوت نہیں دی اس پر جرمانہ کر دیا ہے۔ جی چاہا کہ بڑھ کر لالہ جی کا منہ نوچ لے اور کہے کہ یہی نوکری ہے۔ نہ جس کے بل پر غریبوں کا گلا کاٹ دینا چاہتے ہیں۔ نوکری اپنے گھر رکھئے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

مگر کمزور آدمی کے دل میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں وہ زبان پر

نہیں آتے۔ غم اور غصہ کے خیالات اس کے دل میں پیدا ہوئے دل ہی میں مر گئے اور رام ناتھ کی زبان سے ایک بھی لفظ نہ نکلا۔ جب شام کو دوکان بند ہوئی تو وہ گھر کی طرف چلا۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ بیس برسوں سے بیمار ہے اور اس کی یہ بیماری جسم میں ہی نہیں بلکہ دماغ میں بھی گھسی ہوئی ہے آج اس کی ساری دنیا اُداس تھی۔

(۳)

شانتا نے خاوند کو اُداس دیکھا تو حیران ہو کر بولی۔ آج آپ اُداس سے معلوم ہوتے ہیں کیا بات ہے۔

رام ناتھ نے ٹالتے ہوئے کہا۔ کچھ نہیں۔

شانتا نزدیک آگئی۔ بولی۔ بالکل جھوٹ۔ آپ کا چہرہ صاف کہہ رہا ہے کہ آپ اداس ہیں۔ کوّے نے فاختہ سے کچھ کہہ تو نہیں دیا جو میری فاختہ کا چہرہ اُتر گیا ہے۔

رام ناتھ نے زبردستی ہنسنے کی کوشش کی۔ بولا۔ کیا کہوں۔ کوّے نے کل فاختہ کو دعوت پر اپنے گھر بلایا ہے۔

"اس کا مطلب؟"

"کیا اب بھی اس کا مطلب سمجھانا ہوگا! مطلب ہے کہ کل ہمارے گھر میں ہماری دیوالی نہ ہوگی۔ لالہ جی کے گھر میں دعوت ہوگی"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ لالہ جی کے گھر میں "ایک عدد پوتا" ہوا ہے اور یہ اس کی پہلی دیوالی ہے۔ خوب جلسہ کرنے جا رہے ہیں اور جلسہ لوگوں کے بغیر نہیں ہوتا"

تو آپ نے کہہ نہیں دیا کہ کل ہماری بھی دیوالی ہے۔ دیوالی کے دن کون گھر والا ہے جو گھر سے باہر کھانا کھاتا ہے"

رام ناتھ نے کہا" کہنے سے کیا فائدہ۔ وہ ایک نہ سنتے اور صرف ایک ہم ہی کو نہیں بلایا بلکہ دوکان کے سارے ملازموں کو بلایا ہے"

شانتا" اور سب نے مان لیا ہے کسی نے انکار نہیں کیا"

رام ناتھ" کسی نے بھی نہیں۔ وہ کہتے ہیں چلو ہماری دیوالی لالہ جی کے گھر ہوگی تو خرچ سے بچ گئے۔ مفت کا کھائیں گے"

معاملہ ختم ہوگیا۔ شانتا چپ ہوگئی۔ اچانک اسے ایک راستہ سوجھا جیسے اندھیرے میں دیئے جل اُٹھے ہوں۔ بولی" دعوت آخر کتنے بجے تک رہے گی۔ نو بجے تک ہی تو رہے گی یا دس بجے تک۔ ساری رات تو دعوت نہ رہے گی۔ ہم دیئے بتیاں تیار کر کے جائیں گے۔ آکر جلائیں گے۔ دعوت وہاں چل کر۔ دیوالی اپنے گھر۔ ہاں ذرا دیر ہو جائے گی اس میں کیا ہرج ہے یہ دیوالی ہے۔ بمبئی میل نہیں کہ ٹھیک وقت پر چھوٹ جائے گی"

رام ناتھ کو بھی ایسا محسوس ہوا گویا وہ خواہ مخواہ گھبرا رہا تھا۔ معاملہ اتنا سنگین نہ تھا جتنا وہ سمجھ بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں پھر باتیں کرنے لگے۔ ہنسنے اور مسکرانے لگے۔ دیوالی کے رنگین خواب دیکھنے لگے۔ اور کوّے اور فاختہ کا نام لیکر قہقہے بلند کرنے لگے"

لیکن رنگین ارادے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ لالہ جی کے گھر میں اس رات صرف دعوت ہی نہیں تھی۔ دیوالی بھی تھی گانے بجانے کا پروگرام بھی تھا اور ایک پروفیسر صاحب بھی بلائے گئے تھے جو جادو کے کھیل دکھانے میں دُور دُور تک مشہور تھے۔ ان تمام دلچسپیوں میں کافی

دیکھتے ہیں اور نہایت بے بسی کے عالم میں نارائن بابا آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ جو دراصل کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور جو صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے جو صرف ایک حد ہے جس کے پار ہماری نگاہیں کام نہیں کرتیں۔ البتہ ہم سائنس اور ایک سائنسی نظر اور ایک دوربین کی مدد سے ان حدوں کو جتنا جی چاہے وسیع کر سکتے ہیں

لیکن فوجی ٹرک میں اس سارا بھائی تبادلے میں جو عورتیں لائیں ان میں لاجو نہ تھی سندر لال نے امید و بیم سے آخری لڑکی کو ٹرک سے نیچے اترتے دیکھا اور پھر اس نے بڑی خاموشی اور بڑے عزم سے اپنی کمیٹی کی سرگرمیوں کو دو چند کر دیا۔ اب وہ صرف صبح کے سمے ہی پربھات پھیری کے لئے نہ نکلتے تھے بلکہ شام کو بھی وہ جلوس نکالنے لگے اور کبھی کبھی ایک چھوٹا موٹا جلسہ بھی کرنے لگے جس میں اس کمیٹی کا بوڑھا صدر وکیل کالکا پرشاد صوفی کھنکاروں سے ملی جلی ایک تقریر کر دیا کرتا۔ اور رسالو ایک پیکدان لئے ڈیوٹی پر ہمیشہ موجود رہتا۔ لاؤڈ اسپیکر سے عجیب طرح کی آوازیں آتیں کھا بابا۔ کھا کھا . . . . اور پھر نیکی رام محرر چوکی کچھ کہنے کے لئے اٹھتے لیکن وہ جتنی بھی باتیں کہتے اور جتنے بھی شاستروں اور پرانوں کا حوالہ دیتے اتنا ہی اپنے اور اپنے مقصد کے خلاف باتیں کرتے اور یوں میدان ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سندر لال بابو اٹھتا لیکن وہ دو فقروں کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ اس کا گلا رک جاتا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگتے اور وہ روہانسا ہونے کے کارن تقریر نہ کر پاتا اور بیٹھ جاتا۔ مجمع پر ایک خاص قسم کی خاموشی چھا جاتی۔ اور سندر لال بابو کی ان دو باتوں کا اثر جو کہ اس کے دل کی گہرائیوں سے چلی آتی تھیں وکیل کالکا پرشاد صوفی کی ساری ناصحانہ فصاحت پر بھاری ہوتا۔ لیکن لوگ وہیں رو دیتے اور اپنے جذبات کو آسودہ کر لیتے اور پھر . . . . خالی الذہن گھر لوٹ جاتے۔

وقت گزر گیا۔ شانتا نے بار بار اُٹھنے کا ارادہ کیا۔ مگر لالہ جی کی بیٹیوں نے ہر بار روک لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب لالہ جی کے گھر میں دیوالی کی دعوت ختم ہوئی اور وہ گھر لوٹے تو شہر میں دیوالی ختم ہو چکی تھی اور بازاروں میں کُتے اور بیل بیٹھ چکے تھے۔ اب شانتا اور رام ناتھ کیا دیئے جلاتے۔

دنیا کی دیوالی آئی اور دیئے جلا کر چلی گئی مگر رام ناتھ اور شانتا کے گھر نہ دیوالی آئی اور نہ دیئے جلے نہ بچپن اور جوانی کے رنگین خواب پورے ہوئے۔ دل کی امنگیں دل ہی میں رہ گئیں۔ دونوں منہ پھلائے ہوئے گھر آئے اور اپنی قسمت کو کوس کوس کر سو گئے۔ صبح ہوئی تو دونوں کے جی کچھ ہلکے ہو گئے تھے اس کے بعد دونوں جوانیاں پھر اس طرح مسکرانے لگیں اور انتظار کرنے لگیں دوسرے سال کی دیوالی کا اگرچہ اس کے آنے میں ابھی تین سو چونسٹھ دن باقی تھے۔

(۴)

دوسرے سال دیوالی سے ایک مہینہ پہلے ہی دیوالی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ رام ناتھ کاغذ پنسل لے کر بیٹھ گیا اور شانتا کو بلا کر بولا "اس سال ایسی شان سے دیوالی مناؤ کہ پچھلے سال کی ساری کسر نکل جائے"

شانتا باؤلی بن رہی تھی۔ اس نے جواب دیا "پہلے یہ بتاؤ کہ کوّا کہیں عین وقت پر بی فاختہ کی دعوت تو نہیں کر دے گا۔ ایسی بات ہو تو نہ تیاریاں کریں نہ جی جلائیں"

رام ناتھ "نہیں، بی فاختہ نے پھر پوچھ لیا ہے کہ کوّے کے ہاں اس کے کوئی اور پوتا تو نہیں پیدا ہوا۔ اور کوّے کو خواہ مخواہ دعوتیں کرنے کی عادت نہیں"

شانتا: "چلو یہ چنتا تو مٹی۔ اب بتاؤ اس دن کیا کیا جائے کہ بی فاختہ کا جی چھچھا اُٹھے۔"

رام ناتھ: "دیئے تو پچھلے برس کے پڑے ہوئے ہیں کام آجائیں گے موم بتیاں بھی ہوں گی۔ بشرطیکہ شریمتی جی نے اڑوس پڑوس کو دان نہ کردی ہوں۔"

شانتا: "دان نہیں کی گئیں مگر دیئوں کے لئے تیل لانا ہوگا۔ سرسوں کا تیل۔"

رام ناتھ نے نوٹ بک میں لکھ لیا سرسوں کا تیل۔

شانتا: "اور اب کے مٹھائی بھی تو کوا نہیں بھیجے گا۔"

رام ناتھ نے لکھ لیا۔ مٹھائی اور کھلونے۔

شانتا: "اور لکھو! پھلجھڑیاں، ہوائیاں اور انار۔"

رام ناتھ نے لکھ لیا۔

شانتا نے چاول چنتے چنتے کہا: "اگر بانس اور رنگ برنگے پتلے کاغذ لادو تو دو چار فانوس بھی بنا ڈالوں۔"

رام ناتھ نے لکھ لیا۔ کاغذ، بانس اور دھاگہ۔

شانتا نے چاول کا تھال اُٹھا کر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا اور چاول چنتے چنتے کہا: "میری فہرست تو مکمل ہوگئی۔ اب اگر کچھ اور لانا ہو تو وہ اپنے حساب میں لکھو۔"

رام ناتھ نے نوٹ بک بند کردی اور جواب دیا: "یہ بھید دیوالی کے دن ہی کھلے گا۔ اس سے پہلے نہیں۔"

اسی طرح روز باتیں ہوتیں، نئی نئی تجویزیں سوجھتیں، نئے نئے

خیال آتے اور دیوالی کی رات نزدیک آجاتی تھی۔ رام ناتھ نے شانتا کو بانس اور لال نیلے ہرے پیلے کاغذ لا دیئے تھے اور شام کو گھر آتے ہی پوچھتا تھا "بتاؤ آج کیا بنایا"۔ کبھی معلوم ہوتا۔ آج جھالر بن گئی ہے کبھی ڈھانچے تیار ہو جانے کی بات سنتا۔ اب صرف کاغذ مڑھنا باقی تھا۔ گھریلو کام پورا ہونے میں نہیں آتا تھا۔ شانتا ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتی تھی۔ آخر ایک دن رام ناتھ نے جھلا کر پوچھا "آخر یہ ذرا سا کام پورا کیوں نہیں ہوتا"۔

شانتا نے مسکرا کر کہا "ہو جائے گا۔ حیران کیوں ہوتے ہو۔ دیوالی کے دن آپ کو سارے فانوس تیار نہ ملیں تو میری گردن پکڑ لینا"۔

رام ناتھ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے فانوس کے بارے میں پوچھ تاچھ بند کر دی اور دن گذرتے گئے۔ نہ رام ناتھ نے کچھ پوچھا، نہ شانتا نے خود بتایا۔ یہاں تک کہ ایک دن لالہ سرن داس نے رام ناتھ کو اپنے پاس بلایا اور کہا "دیکھو آج شام کو بنارس جانا ہے۔ گھر جا کر تیاری کر لو"۔

رام ناتھ کا چہرہ لال پڑ گیا۔ دھیرے سے بولا "کتنے دن کا کام ہو گا؟"

انھوں نے کہا "میرا خیال ہے ایک ہفتہ سے زیادہ نہیں لگے گا۔ ویسے اگر تم جاتے ہی ڈٹ جاؤ تو چار پانچ دن میں ہی ہو جائے گا۔ مگر یہ سوال تم نے پوچھا کیوں ہے۔ کیا کوئی خاص بات ہے"۔

رام ناتھ نے سر جھکا کر کہا "بات یہ ہے کہ دیوالی نزدیک آ رہی ہے اور میں دیوالی کے دن گھر میں رہنا چاہتا ہوں"۔

سرن داس "تو کام جلدی پورا کر لینا اور چلے آنا"۔

شانتا نے سنا تو اس کے دل کو دھکا سا لگا۔ مگر نوکری کا معاملہ تھا۔

کیا کرتی۔ پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ اتنا اطمینان تھا کہ رام ناتھ دیوالی سے پہلے لوٹ آئے گا۔

اور رام ناتھ جاتے وقت سوچ رہا تھا کہ شانتا کو معلوم نہیں کہ دیوالی کے دن میں اسے کیا دینا چاہتا ہوں۔ لاہور میں ہوتا تو جمپر دیتا۔ پاؤڈر کا ڈبہ دیتا۔ پرس دیتا۔ اب بنارس جا رہا ہوں تو بنارسی ساڑھی ضرور خرید کر لے آؤں گا۔ شانتا دیکھے گی تو خوش ہو گی۔ اچھل پڑے گی۔ جب میں کوئی کپڑا لاتا ہوں تو وہ اس کپڑے میں کتنی حسین لگتی ہے۔ اب کے ساڑھیوں کے شہر میں جا رہا ہوں۔ بڑھیا ساڑھی خریدوں گا۔ تو وہ کیا یاد کرے گی کہ کسی دل والے آدمی سے بیاہ ہوا ہے۔ دیوالی کے دن ایک دم رانی بن جائے گی اور مسکرا مسکرا کر دیئے جلائے گی۔ مٹی کے دیئے۔ آنکھوں کے دیئے ہونٹوں اور گالوں کے دیئے۔

بنارس جا کر اس نے پہلے دن ہی ساڑھی خریدی اور اسے سنبھال کر ٹرنک میں رکھ لیا۔ ہر روز اسے دیکھتا اور سوچتا کہ شانتا اس میں کتنی بھلی لگے گی۔

مگر دیوالی کا دن آ گیا اور اس کا کام پورا نہ ہوا۔ اس کا دل تڑپتا تھا اس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ اس کی بے بسی اس کے کلیجہ میں چبھ رہی تھی۔ دیوالی کی رات کو بنارس کے گلی کوچوں میں قدم قدم پہ روشنی مسکرا رہی تھی۔ مگر رام ناتھ کے دل میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ٹھنڈا اندھیرا۔ سونا اندھیرا۔ آہوں سے بھرپور اندھیرا۔

دیوالی کے دس دن بعد جب رام ناتھ اپنے گھر لوٹا تو شانتا سے رو رو کر ملا۔

اس نے کہا: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قسمت میں دیوالی کے دیئے بن کر جلنا لکھا ہے۔ دیوالی کے دیئے جلانا نہیں لکھا۔"

شانتا نے کہا: "ایسی بُری باتیں کیوں منہ سے نکالتے ہیں۔ اس سال نہیں تو اگلے سال۔"

رام ناتھ نے ٹرنک سے ساڑھی نکال کر دکھائی۔ "میں نے تمہارے لئے اسے خریدا تھا۔"

شانتا نے فانوس لا کر دکھائے: "میں نے آپ کے لئے یہ تیار کئے تھے۔" اور وہ پھر مسکرانے لگے۔ مگر اس مسکراہٹ میں کوئی امنگ نہ تھی۔ کوئی جوش نہ تھا۔ نہ شانتا نے ساڑھی پہنی نہ رام ناتھ نے فانوس جلائے۔

دن گزرے۔ راتیں گزریں۔ سردیاں گزر گئیں۔ مگر اب رام ناتھ پہلا رام ناتھ نہیں تھا۔ نہ بات بات پر ہنستا تھا۔ نہ بات بات پر قہقہے لگاتا تھا کام کاج میں بھی پہلے کی طرح دلچسپی نہیں رہی تھی، بیٹھے بیٹھے کھو جاتا اور زندگی ایک دھندلی ہاتھ نہ آنے والی دور کی چیز بن کر رہ جاتی۔

وہ سوچتا تھا۔ کیا غریبوں کی چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہیں ہو سکتی؟ وہ موٹر نہیں مانگتا تھا ——— محل اور ہیرے جواہرات نہیں مانگتا تھا۔ دیوالی کی رات اپنی بیوی کے ساتھ اپنے گھر میں چراغ جلانا چاہتا تھا۔ دو سال گذر گئے مگر ان کی خواہش پوری نہیں ہوتی تھی۔ اسے شانتا ہر روز سمجھاتی رہتی تھی ..... اس کی بات وہ سُن لیتا تھا مگر اس کے من کی آگ نہیں بجھتی تھی۔ کہتا۔ تم نہیں جانتیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں کسی امیر کی شکل دیکھتا ہوں تو مجھے زہر چڑھ جاتا ہے۔ ہر امیر لکڑی ہے ہر امیر پتھر ہے۔ وہ اس لئے جیتے ہیں کہ غریبوں کے دلوں کو کچل دیں

اور اپنے اوپر خون کی ایک اور تہہ چڑھا لیں۔

ایک دن اس کے مالک نے بلا کر پوچھا "تمھیں کیا کوئی بیماری ہے؟ ہنستے کیوں نہیں۔ بات کیا ہے"۔

رام ناتھ نے بجھی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "بات تو کوئی نہیں"۔

سرن داس "اگر کوئی بیماری ہو تو بتاؤ میں تمہارا علاج کراؤں گا"۔

رام ناتھ "مجھے کوئی بیماری نہیں"۔

سرن داس "تو پھر خوش کیوں نہیں رہتے؟ جوان ہو، تندرست ہو۔ گھر میں جوان بیوی ہے اور پھر بھی اُداس ہو۔ کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیئے"۔

رام ناتھ "جی وجہ تو کچھ نہیں"۔

سرن داس "تو جھوٹ کیوں بولتا ہے۔ بتا نا کیا تکلیف ہے۔ میں دُور کراؤں گا"۔

رام ناتھ کو یہ میٹھے الفاظ کرارے لگے دیکھتے دیکھتے غصہ سے اس کی آنکھیں لال ہوگئیں۔ اس نے کہا "اپنی ہمدردی رہنے دیجئے۔ آپ ہی قتل کرتے ہیں اور آپ ہی پوچھتے ہیں۔ مجھے تکلیف تو نہیں۔ مکاری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے"۔

سرن داس سُن رہ گیا۔ رام ناتھ اُٹھ کر چلا گیا تھا۔ سرن داس سوچ رہا تھا میرا قصور کیا تھا۔ میں نے تو اپنی دانست میں اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے آج تک میرے سامنے اس طرح سے منہ نہیں کھولا تھا۔ آج .....

شام ہوئی تو خزانچی نے رام ناتھ کو بُلا کر کہا "لالہ جی نے کہا ہے اگر تم ہمارے ساتھ کام نہیں کر سکتے تو اگلے مہینے سے اپنا انتظام کر لو۔ اور اگر

کل لالہ جی سے معافی نہ مانگی تو معاملہ صاف ہو جائے گا۔"

مگر مہینہ گزر گیا۔ اور رام ناتھ نے معافی نہ مانگی۔ اسے نوکری سے جواب مل گیا ——————

(۵)

شانتا نے کہا: "میں ابھی لالہ جی کے گھر جاتی ہوں۔ لالہ جی کی بیوی آپ کو گھر سے آکر نہ لے جائے تو میرا ذمہ۔"

رام ناتھ نے کہا: "جس دن بیوی کی سفارش سے نوکری ملے گی اس دن اپنے اس گھر سے میری لاش ہی نکلے گی۔"

اس کے ایک دوست نے کہا: "اچھا بھابی نہ جائے میں جاتا ہوں۔"

رام ناتھ نے کہا: "میں سرن داس کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ کوئی اس سے ایک بار کہہ دے وہ دس بار آئے گا۔ مگر میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کی نوکری نہیں کروں گا۔"

شانتا نے کہا: "تو کیا کرو گے۔ یہ بھی سوچا ہے آپ نے پیٹ بھی تو بھرنا ہوگا۔ کسی طرح۔"

رام ناتھ نے غصہ میں آکر کہا: "تمہارا پیٹ بھرنے کا ٹھیکہ میں نے نہیں لے رکھا۔ اگر بھوکوں مرنے لگو تو مجھے چھوڑ کر کسی اور کے ہاں بیٹھ جانا۔ میں تمہارا ہاتھ نہیں پکڑوں گا۔"

جگدیش نے کہا: "یہ تو تم لڑائی کی بات کرتے ہو بھائی۔ بھابی نے ایک بات پوچھی تم اس کا سیدھا جواب کیوں نہیں دیتے؟"

رام ناتھ اور بھی بگڑ کر بولا: "سیدھا جواب تو وہ دے جس کی تقدیر سیدھی ہو۔ میری تو تقدیر ہی اُلٹی ہے۔ سیدھا جواب کیسے دوں۔"

یہ کہتے ہی اس کا گلا بھر آیا اور وہ اُٹھ کر اندر چلا گیا۔ سوچتا تھا۔ ان عورتوں کے لئے مرد تو اپنا گلا بھی کٹوا دیں تو بھی خوش نہ ہوں۔

شانتا کا چہرہ سوکھ گیا تھا۔ جگدیش سے بولی "میں نے کون سی بُری بات کی ہے جو گالیاں دینے پر اُترا ئے"

جگدیش نے اسے تسلی دی مگر تین چار مہینے گذر گئے اور رام ناتھ کو نوکری نہ ملی۔ کوئی تنخواہ کم دیتا تھا۔ کوئی کام زیادہ لیتا تھا۔ کوئی کہتا تھا جس کا گذارہ سرن داس سے نہیں ہو سکا وہ ہمارے ساتھ کیوں کر چل سکے گا۔

شانتا کے زیور بکنے لگے اور اس کے ساتھ ہی اس کی مسکراہٹ بھی ختم ہو گئی۔ رام ناتھ بے حد پریشان تھا وہ چاہتا تھا کہ روپیہ ہو تو شانتا مسکرائے اور شانتا سوچتی تھی کہ خاوند سمجھے گا کہ اس کی بیکاری میں مسکرا کر اسے چڑا رہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے اتنے نزدیک ہو کر بھی کتنے دُور تھے۔ ایک دوسرے کے اپنے ہو کر بھی پرائے تھے۔

رام ناتھ نے اخباروں میں پڑھا پولیس نے انقلاب پسند شیکھر کی گرفتاری کے لئے دس ہزار روپئے کا انعام رکھا ہے وہ سوچنے لگا۔ اگر مجھے شیکھر کا پتا لگ جائے اور میرے گھر میں فاقہ کشی ہو رہی ہو تو کیا میں اسے پکڑوا سکتا ہوں۔ کبھی سوچتا بُری بات ہے۔ کبھی سوچتا ٹھیک ہے اور پھر سوچتا۔ نہ میرے گھر ایسی فاقہ کشی ہو رہی ہے نہ مجھے شیکھر کا پتہ ہے۔ پھر میرے دل میں یہ بات کیوں آئی۔

ایک دن جگدیش نے آکر کہا "ایک ضروری کام ہے کرنا ہوگا۔ ایک دیش بھگت کی مدد کرنا ہے"

رام ناتھ نے چونک کر کہا "کون ہے وہ؟ کیا معاملہ ہے۔ کیا دیش بھگتی کرتے کرتے پھنس تو نہیں جاؤں گا"

جگدیش نے کہا "یہ ایک لفافہ ہے ایک آدمی کو پہنچانا ہے۔ یہی ایک کام ہے"

رام ناتھ نے کہا "کس آدمی کو؟"

جگدیش نے کہا "اس وقت نام نہ پوچھو۔ پھر بتا دوں گا"

رام ناتھ کا شک اور بھی بڑھ گیا۔ اس نے کہا "کام لینا ہے تو ساری بات بیان کر دو۔ مجھے معلوم ہونا چاہئے اس کا نام کیا ہے۔ اس نے کیا جرم کیا ہے۔ اس لفافے میں کیا ہے ورنہ میں اس کام میں ہاتھ نہ ڈالوں گا"

جگدیش سوچ میں پڑ گیا۔ وہ دل ہی دل میں رام ناتھ کی ایمانداری کو تول رہا تھا۔ آخر میں اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "اخباروں میں شیکھر کا نام پڑھا ہوگا۔ یہ لفافہ اسی کو دینا ہے۔ اس میں روپیہ ہے۔ یہ روپیہ لے کر وہ کافی دن تک چھپا رہے گا۔ پولیس نگرانی کر رہی ہے تم پر کسی کو شک نہیں اس لئے تمہارا کوئی پیچھا نہیں کرے گا"

رام ناتھ کا خیال ٹھیک نکلا۔ اس نے لفافہ ہاتھ میں لے لیا اور پوچھا۔ "وہ کہاں ملے گا۔ میں اسے کیسے پہچانوں گا۔ وہ مجھ پر کیونکر پورا پھروسہ کریگا"

جگدیش نے کہا "وہ پرسوں شام کے پانچ بجے سے ساڑھے پانچ بجے تک شالامار باغ میں تمہارا انتظار کرے گا۔ اس کا کوٹ گہرے نیلے رنگ کا ہوگا۔ اس کی آنکھوں پر کالے رنگ کا چشمہ ہوگا۔ آپ دھیرے سے "کالے بادل" کہیں گے تو وہ آپ پر وشواس کرے گا"

رام ناتھ سوچتا تھا کروں یا نہ کروں۔ اب کوئی "اگر مگر" نہ تھا۔ اب وہ

شیکھر کا پتہ جانتا تھا۔ اب وہ اُسے گرفتار کرا سکتا تھا۔ اب وہ انعام لے سکتا تھا اور یہ انعام دس ہزار روپے کا تھا۔ دس ہزار روپے بہت ہوتے ہیں۔ اور وہ پائی پائی کو محتاج تھا۔ مگر کیا وہ یہ پاپ کرے گا۔ وہ کانپ اُٹھا۔ اس کے دل نے اس سے نفرت کی۔ ضمیر نے لعنت بھیجی۔

اس دن رام ناتھ نے وہ کام کیا جو وہ کبھی نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ سرن داس کی دوکان پر گیا اور کہنے لگا "میں نے حماقت کی۔ مجھے افسوس ہے۔ معافی چاہتا ہوں"

رام ناتھ کے لئے یہ بہت تھا مگر وہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔ اسے اُمید تھی کہ سرن داس کہے گا۔ میں نے تمھیں معاف کیا۔ تم کل سے اپنی نوکری پر آجاؤ۔

مگر سرن داس نے یہ نہیں کہا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ "ارے بھائی اس میں معافی مانگنے کی کیا بات ہے۔ نوجوانوں سے ایسا ہو ہی جاتا ہے مگر میں پھر بھی خوش ہوں اب میرا دل صاف ہے"

الفاظ میٹھے تھے۔ مطلب کڑوا تھا۔ رام ناتھ اُداس ہو کر لوٹ آیا۔ مگر وہ مایوس نہ تھا اس کے بعد ایک دوسری دوکان پر گیا اور پھر تیسری دوکان پر گیا۔ مگر تقدیر کے دروازے سب جگہ بند ہو گئے تھے۔ اب رام ناتھ مایوس ہو گیا۔ ٹوٹے ہوئے دل سے گھر لوٹا۔ اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

شانتا نزدیک آئی۔ اپنا ایک لہنگا دیتے ہوئے اس نے کہا "اگر ہو سکے تو اسے بیچ آیئے"

رام ناتھ کے دل پر گویا کسی نے چھری پھیر دی ہو، وہ آہ بھر کر اُٹھا اور اس نے شانتا کو سینے سے لگا لیا اس کے منہ سے ایک ہی لفظ نکلا۔

ایک روز کمیٹی والے سانجھ کو بھی پرچار کرنے چلے آئے اور ہوتے ہوتے قدامت پسندوں کے گڑھ میں پہونچ گئے۔ مندر کے باہر پیپل کے ایک پیڑ کے اردگرد سیمنٹ کے تھڑے پر کئی شردھالو بیٹھے تھے اور رامائن کی کتھا ہو رہی تھی اور نارائن بابا رامائن کا وہ حصہ سنا رہے تھے جہاں ایک دھوبی نے اپنی دھوبن کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے کہہ دیا تھا ——— میں راجہ رامچندر نہیں جو اتنے سال راون کے ساتھ رہ آنے پر بھی سیتا کو بسا لے گا اور رامچندر جی نے مہاستونتی سیتا کو گھر سے نکال دیا تھا اور ایسی حالت میں جبکہ وہ گربھ وتی تھی۔ کیا اس سے بھی بڑھ کر رام راج کا کوئی ثبوت مل سکتا ہے؟ نارائن باوا نے کہا ——— یہ ہے رام راج! جس میں ایک دھوبی کی بات کو بھی اتنی ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ———

کمیٹی کا جلوس مندر کے پاس رک چکا تھا اور لوگ رامائن کی کتھا اور شلوک کا ورنن سننے کے لئے ٹھہر گئے تھے۔ سندر لال نے آخری فقرے سنے اور کہا ——

"ہم ایسا راجیہ نہیں چاہتے —— بابا بابا ——"

"چپ رہو جی"— "تم کون ہوتے ہو؟" "خاموش!" مجمع سے آوازیں آئیں اور سندر لال نے بڑھ کر کہا۔ "مجھے بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

ملی جلی آوازیں آئیں —— "خاموش! ہم نہیں بولنے دیں گے۔" اور ایک کونے میں سے یہ بھی آواز آئی —— "مار دیں گے!"

نارائن بابا نے بڑی میٹھی آواز میں کہا —— "تم شاستروں کی مان مریادا کو نہیں سمجھتے سندر لال!"

سندر لال نے کہا۔ میں ایک بات تو سمجھتا ہوں باوا! کہ رام راج میں دھوبی کی آواز سنی جاتی ہے لیکن رام راج کے چاہنے والے سندر لال کی آواز نہیں سنتے۔

"شانتا" ——— اور وہ رونے لگا۔ شانتا رونے لگی۔ گھر کی دیواریں رونے لگیں۔

●

تھوڑی دیر بعد جب وہ اکیلا ہوا تو اس کی آنکھوں کے سامنے کبھی شانتا کا اُداس چہرہ آتا تھا۔ کبھی دیوالی آجاتی اور کبھی سرن داس کا چہرہ۔ وہ ان کالے سایوں سے بھاگنا چاہتا تھا مگر کالے سائے پھر اسے آپکڑتے تھے۔ کبھی شانتا۔ کبھی دیوالی۔ کبھی سرن داس۔ اور اس کے ساتھ لوہے کے لوگ، لکڑی کے لوگ۔ پتھر کے لوگ۔ جو پگھلتے نہیں ——— پھسلتے ہیں ——— برستے ہیں ——— اور کچلتے ہیں۔ اس کے سامنے فاختہ آجاتی جو مرمر کر انڈے دیتی ہے۔ کبھی کوّا آجاتا جو انڈے کھا جاتا ہے اور کبھی دوسرے جانور آجاتے۔

دوسرے دن شام کے وقت پولیس شیکھر کا پتہ پاکر اسے پکڑنے کے لئے شالامار باغ چلی گئی۔ وہاں شیکھر مارا گیا۔ جگدیش پکڑا گیا۔ اخباروں میں شور مچ گیا۔

(۶)

اب رام ناتھ پہلا رام ناتھ نہ تھا۔ اس کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا تھا۔ اب اس نے ایک ہوٹل کھول لیا تھا۔ اب اس کے پاس کئی نوکر کام کر رہے تھے۔ اب وہ اچھا پہنتا تھا۔ اچھا کھاتا تھا اور سرن داس کی دوکان کے سامنے سے اینٹھ کر گذرتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ خوش نہیں تھا اور شانتا اسے بار بار پوچھتی "یہ روپیہ کہاں سے آگیا"۔ وہ بار بار جھوٹ بولتا تھا۔ ایک عورت نے اُدھار دیا ہے اور ہر بار جب جھوٹ بولتا تھا اس کے سامنے شیکھر کی شکل گھوم جاتی اور اس پر رات کی نیند حرام ہوجاتی تھی۔ تسلی صرف اتنی تھی کہ شانتا آرام کی نیند سو سکتی تھی۔ اس کی دنیا میں کوئی

"پچھلے سال الہ آباد میں جرنلسٹوں کی کانفرنس ہوئی" سرشاہ بولے "پنڈت جواہر لال اس کا افتتاح کرنے کے لئے آتے ہوئے تھے۔ مجھ سے کچھ اخبار نویس دوستوں نے کہا کہ سرشاہ، آپ کو ایک ڈنر دینا پڑے گا۔ میں نے دو ہزار روپے اس مد میں الگ کر دیئے۔ لیکن اسی رات ریڈیو سے مرکزی حکومت کا ایک آرڈیننس سنایا گیا کہ تیس سے زیادہ افراد کو کسی پارٹی میں نہیں بلایا جاسکتا اخبار نویس دو ڈھائی سو کے قریب تھے۔ ڈنر ملتوی کر دینا پڑا۔ لیکن ہم نے تو دو ہزار روپے دان کر دیئے تھے۔ اور دان دیدیا سو دیدیا۔ فکر ہوئی اس روپے کا کیا کیا جائے؟ پریاگ میں ہم جتنے دن بھی رہتے ہیں۔ ترمینی کے اشنان کو ضرور جاتے ہیں۔ علی الصباح ترمینی میں اشنان کر کے ہم نے جو بھگوان میں دھیان لگایا تو پریرنا[1] ہوئی کہ اس روپے کو ہم کملا نہرو ہسپتال کے لئے دے دیں۔ پنڈت جی تو الہ آباد میں تھے ہی۔ ہم نے دو ہزار کا چیک جیب میں ڈالا۔ اور آنند بھون پہنچے۔

پنڈت جی اندر مصروف تھے۔ کئی لوگ باہر ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ بیٹھے بیٹھے جب ہم کو آدھ گھنٹہ ہو گیا۔ تو ہم نے پوچھ گچھ کی اور ایک صاحب کو جو بار بار اندر باہر جاتے آتے تھے اور جن کے متعلق معلوم ہوا کہ پنڈت جی کے سکریٹری ہیں اپنا نام دیا۔

سکریٹری صاحب نے کہا "آپ بیٹھئے، میں ابھی آپ کا نام اندر دیتا ہوں" اور وہ اندر چلے گئے۔ آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ جب وہ پھر آئے تو ہم نے چیک نکال کر ان کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ ہمیں تو محض یہ دان دینا تھا اور

---

[1] پریرنا، تحریک (الہام کے معنوں میں استعمال ہوا ہے)

کوئی کام نہیں۔ آپ یہ چیک پنڈت جی کے ہاتھ میں دے دیجئے گا۔ ہم جاتے ہیں۔

یہ سُن کر سکریٹری صاحب نے ہاتھ جوڑے۔ ہم نے کہا کہ پانچ منٹ ہم اور تکلیف کریں اور وہ چیک لئے ہوئے اندر چلے گئے۔

چند لمحوں بعد واقعی پنڈت جی دروازے میں نظر آئے۔ سب لوگ گھبرا کر اُٹھے۔ مگر وہ پورے اٹھ بھی نہ پائے تھے کہ ایک خفیف سے تبسم کے ساتھ، جو نہ جانے کس کے لئے تھا، پنڈت جی نے کسی مخصوص فرد کی طرف دیکھے بغیر انگریزی میں کہا "آپ لوگوں سے ملاقات ہی نہ ہوسکی"۔ ذرا اور مسکرائے اور جیسے نمودار ہوئے تھے ویسے ہی غائب ہوگئے۔

بلراج قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ نردتم بھی خاموش نہ رہ سکا۔ ڈاکٹر بوس نے، جو اس کہانی کا ایک ایک لفظ پی رہے تھے۔ حیرت سے یہ ظاہر کرتے ہوئے کھیسیں نکوس دیں کہ دیکھئے دنیا کیا سے کیا ہوگئی ہے۔

سر شاہ ہاہا ہا، اور پھر ہی ہی ہی، کر کے ہنسے، لیکن اس ہنسی میں عجیب سی کھسیاہٹ تھی۔ پھر نردتم نے کہا "آپ بھی سر شاہ کن ناشکروں کو دان دیتے ہیں آپ کو مصرا ایسے آرٹسٹوں کی امداد کرنی چاہئے۔ اس کے عوض آپ ایک پورٹریٹ Portrait بھی پاجائیں تو اس کی قیمت کبھی ہزاروں لاکھوں ہوسکتی ہے"۔

"اچھا تو آپ پورٹریٹ بھی بناتے ہیں"۔ سر شاہ ہنسے "ہاہا، خوب خوب: ہی ہی ہی"۔

ڈاکٹر بوس بھی اپنے خواب سے چونکے اور انھیں اپنے فرض کا احساس ہوا "پورٹریٹ پینٹنگ میں مصرا ایک دم ایکسپرٹ ہے"۔ انھوں نے میری

بیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "وہ دیکھئے سامنے لگی ہوئی مزدور کی تصویر۔ اس نے پانچ منٹ میں بنائی ہے۔ آپ نے میرے ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی میری تصویر نہیں دیکھی۔ وہ بھی اسی کی بنائی ہوئی ہے۔" اور انھوں نے شاباشی کے طور پر پھر میری بیٹھ تھپتھپا دی۔

سر موصوف نے ان کا اشارہ نہیں سمجھا۔ یا سمجھ کر بھی ٹال گئے۔ انھوں نے کلائی میں لگی ہوئی گھڑی دیکھی، چائے کا آخری گھونٹ لیا اور ڈاکٹر بوس کے جواب میں ہا ہا ہا، خوب خوب، ہی ہی ہی کر دیا۔

میں سچ کہتا ہوں تر پا تھی، ندامت سے میری گردن جھک گئی۔ میں نے اپنے آپ کو اس لڑکی سا محسوس کیا۔ جس کو دیکھنے والے لوگ آئے ہوں۔ اپنی پسند یا ناپسند کے بارے میں کچھ بھی اشارہ نہ کر رہے ہوں اور جب کے سرپرست کبھی اس کی ایک خوبی کی تعریف کر رہے ہوں اور کبھی دوسری کی اور وہ لڑکی احساسِ ندامت سے مرتی جائے۔

چائے پی کر سب اٹھے۔ باہر کے دروازے کے دونوں طرف اندر کی جانب، میں نے اجنتا کی دو تصویریں بنا رکھی ہیں۔ تم نے بھی جن کی بارہا تعریف کی ہے۔ ایک لمحے کے لئے سر شاہ کی نظر ان دو شہزادوں کے نیم عریاں گداز جسموں اور ان کے خطوط پر گئی۔ اسی وقت ڈاکٹر بوس نے کہا۔ "سر شاہ، یہ دونوں تصویریں تو آپ کے ڈرائینگ روم میں ہونی چاہئیں۔ اسی طرح دروازے کے دونوں جانب! مصر اسے کہئے کہ عمدہ کپڑے پر انھیں بنالے۔ اجنتا کا آرٹ ہے یہ۔"

"ہا ہا ہا، اجنتا کا آرٹ تو ہمارے گھر ہی میں ہے۔ ہی ہی ہی۔" سر شاہ نے باہر نکلتے ہوئے کہا: "میرے لڑکے کی سسرال ہے وہاں! ہا ہا ہا

..... ہی ہی ہی ....."

اس وقت اپنی اس کوشش کی ناکامی پر اگرچہ ہمارے سب کے چہرے اتر گئے تھے، لیکن سب ہی سر شاہ کی اس بات پر ہا ہا ہا، ہی ہی ہی کر اُٹھے۔ جب سر موصوف، ان کے صاحبزادے اور ڈاکٹر بوس موٹر میں سوار ہو گئے اور موٹر چلی گئی تو بلراج نے چڑھ کر کہا۔

"یہ سب اپنے مطلب کے دانی ہیں ــــ ان کے دان اور فن کی سرپرستی میں ان کی ذاتی اغراض پوشیدہ رہتی ہیں۔ تم ٹھہرے گمنام آرٹسٹ، تمہاری سرپرستی سے انھیں کیا فائدہ ہے؟"

میں خاموش رہا۔ اپنے ان دوستوں پر مجھے بے حد غصہ آیا۔ جنھوں نے مجھے اپنے سیدھے راستے سے ہٹا کر ایسی اذیت بخش پوزیشن میں ڈال دیا۔ اسی وقت تمہاری یاد بھی آئی۔ کیونکہ دراصل اس صورت حالات کی ذمہ داری تمہیں پر ہے۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ ایسی بات نہیں۔ جو دوسرے کے کہنے پر کنوئیں میں چھلانگ لگا دے۔ اس سے بڑا احمق اور کون ہو سکتا ہے۔ خیر، اس تلخ تجربے سے یہ بات تو سمجھ میں آگئی کہ آرٹسٹ کو اس سماج اور اس کے ستونوں یعنی سرمایہ داروں سے سرپرستی کی توقع نہ کرنی چاہیے۔ اس کی قدر اور سرپرستی یہ سڑا گلا سماج اور اس کے کھوکھلے ستون نہ کر سکیں گے۔

تمہارا آنند کمار مصرا

ابھی جب میں یہ خط لفافے میں بند کرنے جا رہا تھا۔ ڈاکٹر بوس کا ایک نوٹ ملا ہے کہ سر شاہ میرے فن سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ میں پنڈت جواہر لال کی ایک خوبصورت تصویر بنا دوں۔ تو وہ اسے ان کی سالگرہ

پر ان کے حضور میں تحفہ کے طور پر پیش کر دیں۔ ڈاکٹر بوس نے اس کامیابی پر مجھے مبارکباد دی ہے اور لکھا ہے کہ میری قسمت چمکنے میں اب دیر نہیں۔ سر شاہ پنڈت جی کی کچھ تصویریں بھیجیں گے۔ ان میں سے جو سب سے اچھی ہو اسے چن کر میں ایک بہت عمدہ رنگین شبیہ تیار کر دوں۔

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں معاوضہ کی فکر نہ کروں۔ سر شاہ فن کے بڑے نقاد ہیں۔ تصویر انھیں پسند آگئی تو وہ اتنے دام دیں گے کہ میرے لئے جائے شکایت نہ رہے گی۔

جی میں تو آتا ہے۔ لکھ دوں کہ وہ فن کے جتنے بڑے قدر دان ہیں، میں بخوبی جان گیا ہوں۔ مگر سوچتا ہوں کہ خاموش رہ جاؤں۔ کوئی دوسرا فن کار شہرت یا اجرت کے عوض خواہ دن بھر بھینس کے آگے بین بجاتا رہے۔ لیکن مصور کے لئے ایسا کرنا ناممکن ہے۔

عزیز احمد

کٹھ پتلیاں

اس نے پھر ٹیلیفون کیا اور ٹیلیفون پر پھر وہی قہقہوں کا سیلاب آیا۔ "کون ؟ گز ؟ (وہ غضنفر کو آکسفورڈ کے زمانے سے گز کہا کرتی تھی) تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ یہاں ؟ پورا بوائے۔ کہاں ٹھہرے ہو۔ امپریل۔ ہاں۔ ہاں۔ ضرور ضرور آؤ۔ سنو۔ آج شام کو کچھ کام ہے ؟ تو پھر ڈرنکس کے لئے آؤ۔ نِک ؟ نِک دورہ کرنے ڈیرہ اسمٰعیل خاں گئے ہوئے ہیں۔ تمہیں مکان مل جائے گا ؟ ..... اچھا شام کو چھ بجے کے قریب۔"

غضنفر نے آہستہ سے ٹیلیفون کا ریسیور رکھا۔ سامنے فیروز پور کی وہی دونوں خوش پوش منیجر سے کسی چیز کی فرمائش کر رہی تھیں۔ کھانے کے کمرے میں لاتری دیاتا کا خون کیا جا رہا تھا۔ جی چاہتا تھا دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی جائیں۔

"اولڈ جل" اس نے پتلون کی جیب میں ہاتھ گھسیڑے اور جل کا خیال

کر کے مسکراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔

جل کو وہ کیمرج کے زمانے سے جانتا تھا۔ اب تک وہ اسنیپ کہیں پڑا تھا جس میں کنگس کالج کے پھاٹک میں کھڑے ہو کے اس نے، جل نے اور روبن شتائن نے تصویر کھنچوائی تھی۔ تصویر میں اس کا موٹا، سبز، اونی کوٹ بڑا ڈھیلا ڈھالا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بالکل حاملہ معلوم ہو رہی تھی۔ حالانکہ بیچاری خیر فرشتہ تو وہ اس زمانے میں بھی نہیں تھی۔ ابھی تک کین روبن شتائن سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ وسطِ یورپ سے کیوں انگلستان خصوصاً کیمرج آئی ہے۔ کیونکہ یونیورسٹی سے جل کو کوئی خاص واسطہ نہیں تھا۔ مگر اس سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں وہ انگریزی بالکل انگریزوں کے لہجے میں بولنے لگی تھی لیکن اس کے آداب اور اخلاق وسطِ یورپ ہی کے تھے۔ کچھ وی آنا اور کچھ بُوداپست۔ وی آنا زیادہ اور بُوداپست کم۔

فشر باستائی سے بُوداپست کے دوسرے سرے تک چاندنی راتوں میں کشتی دوچکر کرتی تھی۔ ایک رات کے آٹھ بجے سے دس بجے۔ دوسرا چکر دس بجے سے بارہ بجے تک۔ ایک طرف بودا اور ترکوں کی یلغار اور قرونِ وسطیٰ اور دوسری طرف پست اور ہاپس بُرگوں کا آخری زمانہ اور بیسویں صدی۔ روبن شتائن نے اسی کشتی پر دس سے بارہ بجے تک والے چکر میں جل کے ساتھ وی آنا کا والتس ناچتے ناچتے کہا تھا "سرت لک" ہنگری زبان کے یہی دو لفظ اسے یاد تھے۔ اور الفاظ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جل کی روح جرمن تھی، صدفی صد آسٹریائی۔ اس نے چڑ کے کہا "ہنگروی میں تو مجھ سے عاشقی مت کرو" اور تھوڑی دیر کے بعد جذبات کی رَو میں وہ بھی بہہ گئی۔ چاندنی میں سبزی

سے ڈھکا ہوا ڈینیوب کے بیچوں بیچ "جزیرہ مارگرت" تھا۔ خوابوں کی پامال دنیا لیکن ماریا تھریسا کی یادوں میں دوڑ گئی۔ دینیوب نیلی نہ سہی، گدلی سہی چاندنی رات میں ملگجی سہی لیکن مارگرت انزل کے پاس تو چاندنی جادو سا کرتی معلوم ہوتی تھی اور چھوٹے سے بینڈ کے سامنے کھڑے ہو کر کسی نے گانا شروع کیا۔

"ملکہ

حسین ملکہ

وہ صرف ملکہ نہیں

عورت بھی ہے۔"

کئی سال پہلے کا وی آنا اور بُوڈاپسٹ پھر سے زندہ ہو گیا۔ اس دریا کی روانی میں جو ان دو شہروں کو ملاتا ہے۔ وسطِ یورپ رومان اور گیتوں کی شاہراہ۔

اس رات روبن شتائن نے پروپوز کیا اور جل نے مان لیا۔

"بالکل اس طرح"۔ روبن شتائن نے چٹکی بجا کے غضنفر کو سمجھایا۔

"اس طرح"۔ جل نے بھی چٹکی بجائی۔

تعطیلات کے زمانے کے حالات جو ہنی مون کے زمانے کے حالات تھے روبن شتائن نے سنانے شروع کئے۔

اور پھر کئی سال گزر گئے۔ مارچ کی ایک شام تھی۔ ہواؤں کی خنکی ذرا کم کم ہو گئی تھی۔ یہ ہوائیں پرانے قلعہ کو تو زیب دیتی تھیں لیکن نئی دلّی کے اس طویل و عریض سبزے پر جو مہاراجاؤں کے محلوں سے شروع ہو کے امپریل سکریٹریٹ کے قریب ختم ہوتا تھا جس کی آبیاری کے لئے وہ نہریں پھر سے

جاری کی گئی تھیں جو صدیوں پہلے چاندنی چوک میں خشک ہو چکی تھیں۔ اس سبزے پر یہ ہوا ذرا غیر سی معلوم ہوتی، اجنبی اور ناگوار۔ ابھی تو مارچ ہی کا موسم تھا۔ اتنی جلدی گرمی کو ذرا سی بھی جھلک دکھانے کا کیا حق حاصل تھا۔ ابھی تو چھ مہینے پڑے تھے۔

انڈیا گیٹ سے آگے سبزے کے کنارے ٹہلتے ٹہلتے یہ دونوں چلے جا رہے تھے۔ غضنفر اور شفیع ایک جگہ ٹوٹے ہوئے بام و در نے سنایا بھی۔ ان فرنگیوں کو حکومت کرنا کیا خاک آئے گا۔ یہاں مغلوں نے حکومت کی ہے۔

شفیع نے گھڑی دیکھی۔ "سوا سات، ڈنر تو ساڑھے آٹھ سے ہے نا؟ اطمینان سے کپڑے بدل سکتے ہیں۔"

"میں سوچ رہا تھا کہ مغلوں کے زمانے میں دلّی لاکھ شاندار رہی ہو۔ طبعی زندگی بسر کرنے کا ہنر یورپ والوں ہی کو آتا ہے۔ اسی سبزے کو دیکھئے نا۔ اس کی کشادگی کو یہ نہیں کہ ذرا سے علاقے میں سرو کے یا چنار کے ہزار درخت لگا دیئے ہوں۔ ....."

"ہاں۔" شفیع نے پان چباتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

دفعتاً غضنفر نے آنکھیں پھاڑ کے سامنے دیکھا۔ یہ تو جل تھی ایک آنریبل ممبر کے ساتھ۔

بے اختیار غضنفر کی زبان سے نکل گیا۔ "جل، جل تم یہاں کہاں؟"

جل بلو کہہ کے تصنع سے مسکرائی۔ جلدی سے آنریبل ممبر سے اس کا تعارف کرایا۔ شفیع کی طرف دیکھ کے سر ہلایا۔ معذرت کی اور چلدی۔

"اچھا تو یہ بات تھی۔" غضنفر نے اپنے آپ سے ذرا بلند آواز سے کہا۔

شفیع ہنسنے لگا۔ "یہاں یہ کچھ عرصے سے ہے تمہیں معلوم نہیں تھا؟ سردوالفقار حسینی کی سکریٹری ہے۔ فرخندہ نگر بھی آئی تھی ان ہی کے ساتھ۔ سردوالفقار حسینی